10806

جلد ۷ شمارہ ۱

جنوری ۔ جون ۱۹۹۰

اردو اشاعت ششماہی

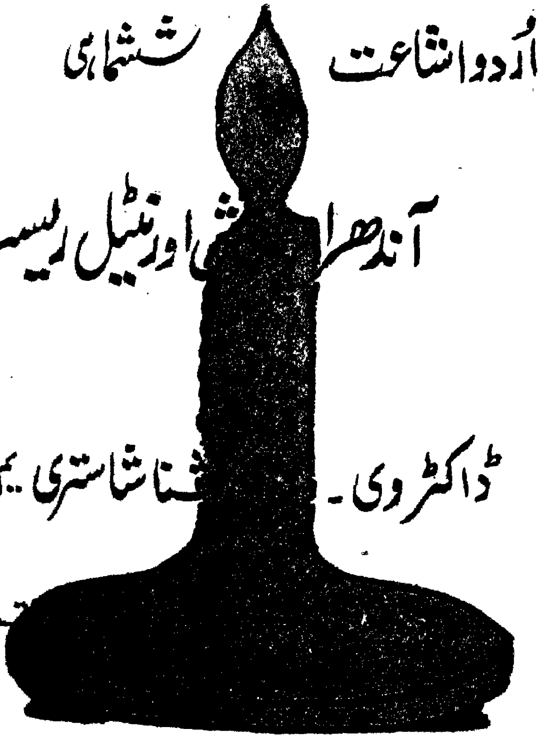

آندھرا ...ی اورنیٹل ریسرچ جرنل

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر وی۔ ...شنا شاستری ایم اے۔ پی ایچ ڈی

... آندھرا پردیش

مُدیر

میر کرامت علی خان ایم اُے ایل (عثمانیہ) ریسرچ افسر

S.V. ... LIBRARY
TIRUPATI
15865

جلد ۷ شمارہ ۱

جنوری - جون ۱۹۹۰

اردو اشاعت ششماہی

آندھرا پردیش اورینٹل ریسرچ جرنل

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر وی - وی - کرشنا شاستری ایم اے - پی ایچ ڈی

ناظم کتب خانہ و ادارہ تحقیق مخطوطات مشرقی حکومت آندھرا پردیش

مُدیر

میر کرامت علی خان ایم او ایل (عثمانیہ) ریسرچ افسر

اِس شُمارے میں

		صفحہ نمبر
۱۔ خسرو و حسن بحیثیت شاعر	ڈاکٹر زیب النساء لکچرار فارسی جامعہ عثمانیہ	۴
۲۔ موسیو ریمانڈ	اعظم الحسینی آرکیوسٹ، اے پی اسٹیٹ آرکائیوز	۲۱
۳۔ گجرات کے جلد ساز	ڈاکٹر احمد حسین قلعہ داری	۳۴
۴۔ دکنی انوارِ سہیلی کا لسانیاتی جائزہ	سعیدہ بیگم لکچرار کالج آف لنگویجس	۴۱
۵۔ صاحب حیدر آبادی (حیات اور کارنامے)	اقبال جہاں قدیر	۵۶
۶۔ دکنی شاعری میں سی حرفی کی روایت	محمد نسیم الدین فریس ریسرچ اسکالر	۶۴

اپنی بات

قبل ازیں "وگیانہ سرسوتی ریسرچ جنرل" سہ ماہی کے چار شمارے اور ایک ششماہی شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ادارہ کو اس بات کی مسرت ہے کہ محققین پروفیسرس اور لکچرر صاحبان نے ادارہ سے قلمی تعاون فرمایا۔

سالِ رواں کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی کی جانب سے اُردو عربی اور فارسی زبانوں کے مخطوطات "دیوانِ حفیظ"، "اتحاف الترکی"، اور "تاریخ آصف جاہی" کی ایڈیٹنگ کروائی گئی اور سالِ گذشتہ کے ایڈیٹنگ کردہ مخطوطات بالترتیب "کلیات ایجاد" "تاریخ عادل شاہی" اور "منہاج الراضی" کی اشاعت عمل میں لائی گئی اس کے ساتھ ساتھ Unclassified مخطوطات کے زائد از ایکہزار Compra hensive Catalogue کارڈس تیار کروائے گئے۔ شعبۂ تحقیق میں ریسرچ اسسٹنٹ (مُدیر وگیانہ سرسوتی) کو ریسرچ آفیسر کے عہدہ پر ترقی دی گئی مزید براں عربی پنڈت، فارسی پنڈت اور اُردو ٹائپسٹ کی جائیدادیں ڈاکٹر ڈی۔ وی کرشنا شاستری ناظم و جنرل ایڈیٹر وگیانہ سرسوتی کی خصوصی دلچسپی اور جد و جہد سے منظور ہوئیں۔ ان جائیدادوں پر عنقریب تقرر کیا جائے گا۔

ریسرچ اسکالرس کو بعجلت زیراکس کاپی فراہم کرنے کی غرض سے آٹومیٹک زیراکس مشین مہیا کیا گیا ہے اسطرح ناظم صاحب کی خصوصی دلچسپیوں کی وجہ سے "شعبۂ تحقیق" کے دیرینہ حل طلب مسائل کی یکسوئی ہوئی ہے۔

پیش نظر شمارے میں تاریخی و تحقیقی مقالہ جات کے علاوہ ایک معلوماتی مقالہ "گجرات کے جلد ساز" "کتاب شناسی (کراچی)" سے اخذ کیا گیا ہے جس کے لئے ہم ادارہ کتاب شناسی کراچی کے مشکور ہیں۔ ان مقالوں کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر زیب النسا لکچرار فارسی جامعہ عثمانیہ، جناب اعظم الحسینی آرکیوسٹ اے پی اسٹیٹ آرکائیوز، ڈاکٹر احمد حسین قلعہ داری، جناب سعیدہ بیگم لکچرار کالج آف لنگویجس، جناب اقبال جہاں قدیری اور جناب نسیم الدین فریس شامل ہیں۔

اِدارہ کو توقع ہے کہ پیش کردہ مقالہ جات پسند کئے جائیں گے اور قارئین اپنی گرانقدر رائے سے مُستفید فرمائیں گے۔ مُدیر...

ڈاکٹر زیب حیدر
لکچرار آرٹس کالج

خسرو و حسن بحیثیت شاعر

خسرو اور حسن سپہرِ علم کے دو درخشندہ ستارے ہمعصر شاعر تھے۔ نہ صرف یہ شعر و سخن میں باکمال تھے بلکہ ان کی روحانیات بھی مثلِ آفتاب اُجاگر تھیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں آفتاب عالمتاب نظام الدین اولیاء مرکز روحانیات کی طرف کھینچ کر لا رہے ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں ستارے اسی آفتاب کے عکس ہیں اور اسی کا فیض تھا جس نے ان دونوں کو اس طرف متوجہ کیا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ضیاء الدین برنی کی ضیاء پاشیاں اس چیز کو روشن کرتی ہیں کہ یہ دونوں آسمان کے ستارے حضرت نظام الدین اولیاء کے تجلی کدہ پر بغلگیر ہوئے اور یہیں سے انکی دوستی کی ابتداء ہوئی۔ شبلیؒ نے بھی شعر العجم میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ فرشتہ نے بھی انکی دوستی کے واقعہ کو بیان کیا ہے لیکن مصنف تاریخ جلالی نے اس کو ایک افسانوی رنگ دیا ہے جس کا حوالہ ہمیں شعر العجم میں ملتا ہے۔[1]

خسرو و حسن کی دوستی بھی مشہورِ زمانہ ہے اور ان کے ممدوحین بھی تقریباً"

---

[1] شعر العجم جلد دوم

ایک ہی ہیں کیوں کہ دونوں ایک ہی دربار سے منسلک رہے ہیں۔

سعدیؒ سے پہلے متقدمین غزلیں کہتے ہی نہیں تھے یا اگر کہتے بھی تھے تو ان کی غزلیں روکھی پھیکی اور سیدھی سادی ہوتی تھیں لیکن سعدیؒ نے اس رنگ کو بدلا ایک حد تک جذبات، واردات اور معاملات بیان کر کے غزل کے افسردہ قالب میں ایک نئی روح پھونک دی اور اس کا رتبہ کئی درجہ بلند کر دیا۔ امیر حسن اور سعدیؒ کے زمانے میں یہی رنگ زیادہ کامل اور مقبول سمجھا جاتا تھا اور غزل میں ہر شخص اسی کی پیروی کرنا چاہتا تھا۔ حسن اور خسرو نے بھی اسی رنگ کو اپنایا۔ دونوں کا خیال ملاحظہ ہو ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود
گر بنوشی درد از میخانہ دردلے حسن
درد معنی از مے سعدی شیرازی دہی

حسن نے تو سعدی کے تتبع کو کمال تک پہنچا دیا تھا لوگ ان کو "سعدی ہند" کہنے لگے تھے۔ ان کے ہمعصر مورخ ضیاالدین برنی یوں رقم طراز ہیں ؎

ذوم[1] شاعرے از شعرائے یگانہ در عصر علائی امیر حسن سنجری بودہ است و اُورا تالیفات نظم و نثر بسیار و صلامتی ترکیب و روانی سخن آیت بودہ است وازبسکہ غزلہائے وجدانی در غایت روانی بسیار گفتہ است اورا "سعدی ہندوستان" خطاب

---

[1] مقدمہ دیوان حسن سنجری۔

شدہ بود۔ غزلیات جگر سوز او را از چقماق دلہائے عاشقاں
آتش محبت بیروں می آرد و اشعار دل پذیر او راحتے بدلہائے
سخنوراں میرساند و لطائف روح افزائے او مایہ اہل ذوق
است،، و سخن این بزرگ چاشنی شیخ سعدی دارد۔،،

حسن کے پاس غزلیں ہیں لیکن ان میں صرف چند ہی غزلیں پائے کی سمجھی
جاتی ہیں ۔ مولانا شبلی نے ان کی غزلوں کے متعلق یوں اظہار رائے فرمایا ہے

صنف غزل ہمارا کا خاص احساس ہے جو سوز و گداز
جذبہ و اثر ان کے کلام میں موجود ہے وہ ان کے کشتہ محبت
امیر خسرو میں بھی نہیں۔ سوز و گداز ملاحظہ ہو ؎

خسرو کہتے ہیں کہ موسم گل آگیا ہے اور تمام بلبل باغ
کی طرف جا رہے ہیں لیکن جو مرغ تیرے ہجر میں گرفتار ہے
اس کو آشیاں کی ہوس نہیں ہے ؎

گل آمد و بباغ رسیدند بلبلاں
و آں مرغ رفتہ را ہوس آشیاں نبود

کبھی کہتے ہیں کہ خسرو اگر تیرا گل یعنی تیرا محبوب گلزار سے چلا جائے
تو مت رو کیونکہ ہر چمن کے لیے خزاں ضروری ہے۔

خسرو اگر گل تو ز گلزار شد منال
دانی کہ ہیچگاہ گل بے خزاں نبود

لہ شعر العجم جلد دوم

اس شعر میں بے ثباتی دنیا کی طرف بھی اشارہ ہے حسن کا خیال ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں کہ اس سال رونق گل کچھ اچھی نہیں ہے کیوں کہ باغ میں میرا سرو خراماں ہی نہیں ہے ؎

امساں رونق گل نیز آنچناں نبود
بے سرو گل بدیہۂ و بلبل رواں نبود
ایں کارواں گل پس سالے رسید لیک
ما ہے کہ در دست دریں کارواں نبود

علامہ شبلی غزل خسرو کے بیان میں یوں رقمطراز ہیں ؎
"اس وسیع مرقعہ میں صرف امیر موصوف (خسرو) کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں کہ وہ بھی امیر ہی کا فیض ہے۔"

غزل کے میدان میں بعض مقامات پر حسن خسرو سے دو قدم آگے ہیں لیکن قصائد اور مثنوی اور دوسرے اصناف سخن میں وہ امیر خسرو کو نہیں پہنچ سکتے۔ جس کا اقرار خود انہوں نے کیا ہے ؎

خسروا از رہ کرم و میپذیم — آنچہ من بندہ حسن می گویم
سخنم چوں سخن خسرو نیست — سخن ایں است کہ من می گویم

خسرو نے حسن کی خوبیوں کا اس طرح اعتراف کیا ہے ؎

خسرو اشعر تو اسرار حدیث است مگر
کر سخن ہائے تو ام بوے حسن می آید

جامی نے بہارستان میں حسن کے کلام پر یوں اظہار رائے کیا ہے:۔

خواجہ حسن را در غزل طرز خاص است اکثر قافیہ ہائے تنگ و ردیف ہائے غریب می نمود لاجرم از اجتماع آنہا شعرے اگرچہ در بادی الرائے آسان می نماید امادر گفتن دشوار است بنا بر ایں اشعار وے را سہل ممتنع گفتہ اند۔"

صاحب تاریخ فیروز شاہی یوں رقمطراز ہیں:

" من در لطافت و سلاست عقل و تہذیب اخلاق مثل خواجہ حسن ندیدہ ام۔"

باوجود ان تمام خوبیوں کے حسن کم گو شاعر ہیں جس کا انھیں خود اعتراف ہے۔

رسم حسن ہمیشہ چو کم گفتن آمدہ است

زیں بیشتر مجال نداد ایں قصیدہ را

۶۳ سال کی عمر تک انھوں نے جو کچھ لکھا اور قابلِ اشاعت سمجھا وہ دس ہزار ابیات ہیں جو اودھ کے شاہی کتب خانہ کے نسخہ میں غزلوں کے ۵۳۳ اور قصائد کے ۴۹ اور رباعیات کے ۲۰۰۷ جملہ ۶۰۲۷ ابیات بتائے گئے ہیں شکیل احمد صاحب جو حسن پر ریسرچ کر رہے ہیں لکھتے ہیں کہ حسن کے ایک اور دیوان کا ذکر ملا ہے لیکن وہ دیوان ابھی تک لاپتہ ہے اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اس کے برخلاف خسرو نہایت پُرگو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ خسرو نے بہارستانِ جامی کے مطابق چار لاکھ سے زیادہ اور پانچ لاکھ سے کم اشعار کہے۔ فردوسی باوجود قادر الکلام شاعر

ہوتے کے ستر ہزار سے زیادہ اشعار نہ لکھ سکا۔ فردوسی صرف مثنوی کا استاد ہے سعدیؔ غزل کے بادشاہ ہیں کمال اسمٰعیل۔ خاقانی اور انوری۔ ظہیر اور عرفی قصیدے لکھتے ہیں لیکن خسرو ہی وہ تنہا شاعر ہے جس نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور اُس کی قادر الکلامی کی انتہا یہ ہے کہ اس نے عزۃ الکمال اور مطلع الانوار صرف پندرہ پندرہ دن میں لکھیں۔

حسن کے کلام میں خسرو کی طرح روانی تو ہے لیکن غنایت نہیں ملاحظہ ہو خسروؔ:

ایمی بارد ومن می شوم از یار جدا
چوں میکنم دل بچنین روز ز دلدار جدا

حسنؔ: ساقیا مے دہ کہ لے خاست از خاور سفید
سرو را سر سبز شد در برگ را چادر سفید

حسن اور خسرو دونوں کی مشترک خصوصیت ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جن میں خواہ مخواہ بات کو صفائی سادگی اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے حسن کی تو زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحریں ہی ہیں۔ چھوٹی بحر کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا لہجہ نرم ہے اور جذبہ میں گداز ہے۔ خسرو کے کلام میں سوز بہت ہے۔

خسرو کہتے ہیں کہ اے نادان طبیب میرے سرہانے سے ہٹ جا کیوں کہ میں درد ہجر میں مُبتلا ہوں اور میرا علاج سوائے دیدارِ دوست کے نہیں ہے۔

از سر بالیں من برخیز اے ناداں طبیب
درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

حسن اسی مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں کہ طبیب کو میرے درد ہجر کا علم نہیں ہے وہ جو دوا بتلائے گا وہ میرے لئے سود مند نہیں ہو سکتی۔

طبیب علم ندارد ز درد فرقت عشق

چہ سود مند بود شربتے کہ او فرمود

خسرو نے مختلف صنف سخن میں الگ الگ شعراء کا تتبع کیا ہے۔ غزل میں سعدی۔ مثنوی میں نظامی مواعظ و حکم سنائی۔ خاقانی۔ قصائد میں رضی الدین نیشاپوری و کمال اسمٰعیل۔ حسن نے بھی غزل میں سعدی کا پورا پورا تتبع کیا ہے اور اس میں بہت کامیاب رہے ہیں۔ خسرو کا رنگ جداگانہ ہی ہے۔ قصائد میں خاقانی کا تتبع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں خسرو کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ لیکن حسن ان کی پیروی نہ کر سکے۔ مثنوی بھی لکھی ہے لیکن نظامی کا تتبع نہ کر سکے۔ لیکن خسرو خمسہ کے جواب میں اوروں کے مقابلہ میں بہت حد تک پورے اترتے ہیں۔

خسرو اور حسن دونوں کے پاس رعایت لفظی بہت ہے جو سبک ہندی کا طرز ہے۔ اس کو مراعات النظیر بھی کہا جاتا ہے۔

شاخ و برگ محبت و محنت ❊ ہر دو از یک نہال می گیرد

یہاں پر حسن نے شاخ و برگ کی رعایت سے نہال استعمال کیا ہے۔ ایسی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔

حسن اور خسرو دونوں کے پاس وصف نگاری اور مضمون آفرینی موجود ہے۔ حسن کی وصف نگاری ملاحظہ ہو ؎

بتاں کز زلف مشکیں دام کردند ❊ جہانِ زیر ہر مو رام کردند

ور ایک جگہ زلف کا وصف بیان کیا ہے

بندے اگر کشاید از زلف ظالم او

از ہر خمے بر آید فریاد داد خواہی

میں نے کہا ہے اگر اس کے ظالم زلفوں کے بند اگر کھولے جائیں تو ہر ایک خم سے داد خواہوں کی فریاد نکلے گی یعنی میرے محبوب کی زلفوں کا یہ حال ہے کہ اس کے بند میں چاہنے والوں کے دل اسیر ہیں جب یہ بند کھولے جائیں گے تو یہ سب فریاد شروع کر دیں گے۔

خسرو نے بھی اپنے محبوب کی زلف کا وصف اسی طرح بیان کیا ہے

جاں ز بند کالبد آزاد گشت

دل بگیسوئے تو زندانی ہنوز

کہتے ہیں کہ جسم کی قید سے روح تو آزاد ہو گئی لیکن دل ابھی تیرے زلفوں کی قید میں اسیر ہے۔ حسن اپنے محبوب کا وصف یوں بیان کرتے ہیں

سمن ساقی و سوسن بوے ولالہ روے و نسرین بر

تعالی اللہ اگر انصاف نگزار این چنین باید

کہتے ہیں کہ میرا محبوب سمن کی طرح ہے اور اس کے جسم سے سوسن کی بو آتی ہے اس کا چہرہ لالہ کی طرح روشن ہے اور اس کی آغوش نسرین کی طرح ہے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو خود میرا محبوب ایک گلزار ہے مجھے باغ میں جانے کی بھی حاجت نہیں۔

خسرو اپنے محبوب کا وصف اسطرح بیان کرتے ہیں

پری پیکر نگارے، سرو قدے، لالہ رخسارے
سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

اس شعر میں حسن سے زیادہ خسرو کے پاس برجستگی ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ میرا محبوب پری پیکر ہے۔ اس کا قد مانند سرو ہے اور رخسار مانند لالہ اسی لئے ہی گلستان سمجھ کر اس کے سائے میں شب بسر کر رہا تھا اور میرے دل کے لئے ایک آفت بنا ہوا تھا۔

تشبیہ شاعری کے چہرے کا غازہ ہے۔ لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت بنادی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں اُن کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بے کار تھیں۔ امیر خسرو اور حسن نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں۔ قدما پہلے محبوب کی چال کو کبک سے تشبیہ دیتے تھے خسرو نے کبوتر سے سب میں پہلے تشبیہ دی۔

زہے خرامش آں نازنیں بہ عیاری
کبوترے بہ نشاط آمدست پنداری

حسن اور خسرو نے شطرنج کی بہت سی اصطلاحوں کو استعمال کیا ہے۔

خسرو ؎

شطرنج عشق باز کہ ما بہر روئے تو
خود را بما نگاہ رسانیم وشہ کنیم
تخت شاہیست کہ بر فیل نہد فرزیں بند
رخ درین عرصہ منہ بیدق ایں شاہ نہ

حسن ؎

نزد عشقت پاک می بازم ولے ترسم از آنکہ
کعبتین چشم غلطانی مرا بازی دہی

چشم شوخ تو کہ در عین دعا اندازی
مہرہ بر چید ازیں سوختہ اندازی

غزل کی ترقی کا نوروز لطف ادا، اور جدت اسلوب ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں لیکن پھر بھی وہ نقش اولین تھا۔ خسرو اور حسن کی بوقلموں طبیعت نے جدت اسلوب کے سینکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کردیئے جو اگلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آتے تھے۔ ایک غزل بھی امیر خسرو کی ایسی نہیں ملتی جس میں کوئی نئی تشبیہہ نہ ہو۔

حسن کے پاس بھی اکثر نئی تشبیہیں ملتی ہیں لیکن حسن ہر غزل کے کسی نہ کسی مصرعہ میں کوئی بات ایسی کہہ دیتے ہیں جو ایک چبھتا ہوا اثر رکھتی ہے ؎

غلام نرگس مستم کہ با مدادو پگاہ
قدح بدست گرفتہ زخواب برخیزد

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اس کو جام زر سے تشبیہہ دیتے ہیں اور یہ تشبیہہ عام تھی لیکن اس اسلوب بیان میں نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اسکو جام زر ہاتھ آگیا ہے ایک خاص لطف پیدا کردیتا ہے کیونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں اسی لیئے خواب دیکھنے کی توجیہہ وقعت رکھتی ہے۔

خسرو کہتے ہیں ؎ مہروی وگریہ باز آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

یہ بھی انوکھا خیال ہے کہ جب تو جانے لگتا ہے تو مجھے جدائی کے غم سے رونا آتا ہے تو کچھ دیر بیٹھ جاتا کہ بارش ختم جائے یعنی تو جانے کا خیال ہی مت کر کیوں کہ تو جب بھی جانے لگے گا مجھے رونا آجائے گا۔

معشوق کی گراں قدری کو خسرو نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حسن کا خیال ملاحظہ ہو ؎

ما عشق ترا بجاں خریدیم
اینست زعمر حاصل ما

چشم محبوب کو سب مخمور اور مئے آلود باندھتے ہیں۔ خسرو کہتے ہیں مجھے شراب کی ضرورت ہی نہیں جس وقت تیری آنکھوں میں خمار رہے میں تیری مخمور آنکھوں سے ہی مستی پا لیتا ہوں۔

مئے حاجت نیست مستیم را   در چشم تو تا خمار باشد

حسن نے محبوب کی آنکھوں کا وصف یوں بیان کیا ہے۔

چشم او در جادوئی شاگرد کیست
کانچہ او کرد اوستادے ہم نکرد

نہیں معلوم آپ کی آنکھیں جادوگری میں کس کی شاگرد ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جتنا اچھا جادو کر سکتی ہیں ان کا استاد بھی نہ کرے گا۔ چشم محبوب گویا ایک ساحر ہے۔ لطف و قہر کی نگاہ کا فرق ملاحظہ ہو۔

کہتے ہیں کہ کس طرح مارتے ہیں اور جلاتے ہیں تو وہ ان کی نگاہ کا کرشمہ ہے کہ ایک نظر سے تو مارتے ہیں اور دوسری ہی نگاہ میں زندہ کر دیتے ہیں یعنی نگاہِ لطف زندہ کرتی ہے اور نگاہِ قہر مار ڈالتی ہے

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی
از یک نگاہ کشت نگاہِ دگر نہ کرد

حسن اپنے محبوب کے خال و چشم کے بارے میں لکھتے ہیں

پیوستہ بہ دنبالۂ چشمت برود آن خال
ہندو بچۂ ترکِ کماندار بہ بازی

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو یوں ادا کیا ہے

بتِ بوقت تقویٰ و آخر این نمی دانی
کہ در شہر مسلماناں نباید این چنیں آمد

پھر کہتے ہیں کہ تاریک شب تھی اندھیرا جیتا تلخ ہو گیا تھا کہ ناگاہ ایک شمع شکر بار کی آمد ہوئی جس سے زندگی مل گئی۔

تاریک شبے داشتم و تلخ حیاتی
ناگاہ یکے شمع شکر بار در آمد

اسی خیال کو جگر نے یوں پیش کیا ہے

خیالِ یار سلامت تجھے خدا رکھے
ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

خسرو نے معشوق کی زیادتیٔ لطف کو اس انداز سے بیان کیا ہے

جان زِ نظارہ خراب و نازِ او ز اندازہ بیش

ما بہ بوی مست و ساقی می دہد پیمانہ را

حسن نے کس لطف سے اسی خیال کو پیش کیا ہے ؎

اے حسن دست تو در فتراکِ وصلش کے رسد

این طرف فقر توی آں سو غنا ـــــے با کمال

یعنی اے حسن تیرا ہاتھ وصل کی فتراک میں کس طرح پہنچے گا تو تو فقر کی عادت رکھتا ہے لیکن تیرا محبوب غنی ہے۔ اکثر جگہ صرف ایک دو لفظوں کے الٹ پھیر سے عجیب لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں۔

خسرو ؎

چشم بد دور از چناں روے

کہ از وے چشم دور نتواں کرد

یعنی ایسے چہرے سے چشم بد دور رہے جس پر سے نظر ہٹتی ہی نہیں یعنی خوبصورت محبوب کو نظر نہ لگے۔

حسن ؎

اور اکہ از سودات زیاں دیدم گفت

کار سودات گہے سود بود گاہ زیاں

اس شعر میں سودا کہ ایک جگہ معنی خیال کے ہیں اور دوسری جگہ کاروبار عشق میں جو حالات پیش آتے ہیں اُن کے بیان کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں۔ اہلِ لکھنؤ نے اس کا نام معاملہ بندی رکھا ہے۔ بہرحال اس طرز کے موجد جیسا کہ

آزاد نے لکھا ہے امیر خسرو ہیں۔ خسرو کی معاملہ بندی ملاحظہ ہو۔

شبہا بر در آمد بسے کنز دل نہادی یاد را
جانم ز تن آمد بروں بوسے نہ دادی یاد را

حسن ؎

دی سوے سروِ لالہ رخ پیغام دادم باد را
بنوشتہ خطِ بندگی آں سوسن آزاد را

عموماً شعراء اور اہلِ فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہوگئی ہے جس کا نام علمی زبان ہے۔ خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور عام بول چال کی ہونی چاہیے کیوں کہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے۔ قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا ہے اور حسن کے پاس بھی یہ پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا رمز یہی ہے۔

خسرو محبوب سے کہتے ہیں تم نے بہت سے دل لیے ہیں خوب غور کرکے دیکھو جو بہت زخمی ہے وہی میرا دل ہے۔

دل بسے بردۂ نکو بشناس
آں کہ مجروح تر از آنِ من است

حسن کہتے ہیں کعبہ جاکر دعا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے میرا تو کعبہ بھی تو ہی ہے اور مقصود بھی تو ہی ہے۔

گفتی کہ بہ کعبہ رو دعا کن
خود کعبۂ ما توئی دعا یم

خسرو اور حسن نے روزمرہ اور محاورہ کو بھی استعمال کیا ہے۔

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم

کہ از ابروے تو چشم بد و محراب افتاد

تیرا چہرہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ کا دھوکا پڑتا ہے کیوں کہ مجھ کو تیرے ابرو سے دو محرابیں نظر آتی ہیں۔

امیر خسرو نے ایسے بھی کئی محاورے باندھے ہیں جو ان کے سوا کسی اور قادر الکلام شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ مثلاً " از گرہ اُو چہ میرود" " آواز کردن" "گفتار میگویم" مالا کلام کروں، کسی کو ساکت و بند کرنا وغیرہ۔

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے۔ قصائد کا موضوع مدح ہے۔ مثنویوں، قصّے یا اخلاق کے لیے مخصوص تھیں۔ قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں۔ جذبات نگاری کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے۔ قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا کم رواج ہے۔ امیر خسرو اور حسن نے البتہ مسلسل غزلیں لکھی ہیں خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ بہار میں کیا کیا لوازمات ہو اس کی تفصیل اس غزل میں ملتی ہے۔

ہنگام گل است بادہ باید　　　ساقی و حریف سادہ باید

خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے۔ غزل میں اُس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے۔ غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنا امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ حسن نے بھی بعض نئے مضامین باندھے ہیں اور ان دونوں کے کلام میں

قُدما کے مقابلہ میں ایک انوکھاپن اور شگفتگی پائی جاتی ہے ؎

زہے عمرِ درازِ عاشقاں گر
شبِ ہجراں حسابِ عمر گیرند

یعنی اگر شبِ ہجر کو بھی عاشقوں کی عمر میں شامل کر دیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے۔

خسرو کے صنائع بہت بے تکلّف ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آئیں۔ صنعتِ طباق میں اضداد ان کی خاص چیز ہے۔

دردہا داری و درمانی ہنوز

حسن اور خسرو دونوں کے پاس تصوف ہے لیکن عشقِ حقیقی کو بصورتِ مجاز بیان کیا گیا ہے

گر اے زاہد دعائے خیر می گوی مرا این گو
کہ این آوارۂ کوئے بُتاں آوارہ تر بادا

دُنیا کی بے ثباتی کو خسرو نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

یاراں کہ بودہ اند ندانم کجا شدند
یارب چہ روز بود کہ از ما جدا شدند

گو نو بہار آمد و پرسد ز دوستاں
گو اے صبا کہ آں ہمہ گل ہا گیہا شدند

کہتے ہیں کہ جو میرے دوست تھے وہ سب نہ جانے کہاں چھپ گئے معلوم نہیں کس منحوس دن وہ مجھ سے جدا ہوئے تھے کہ آج تک مل نہ سکے۔ نوبہار آکر دوستوں

سے پوچھتی ہے تو کہہ کہ وہ تمام گل زمین میں پنہاں ہو گئے ہیں ان کی خاک پر سبزہ اُگ رہا رہا ہے۔ غالب نے اس خیال کو یوں بیان کیا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اس غزل میں خسرو نے مسلسل بے ثباتیِ دُنیا کا ذکر کیا ہے

حسن کے پاس بھی تصوف بلا کا ہے اور وہی حقیقت و مجاز کا امتزاج ہے۔

از خلد و بہشت بے نیازم تا کوے تو گشت منزلِ ما
گر ز فراقت حسن گم شدۂ حیرتست
ماکہ ترا یافتم یافتم حیران تریم

حسن اور خسرو کی شاعری کی عظمت کا احساس بات سے ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شعراء نے تتبع کیا ہے۔ خواجہ بندہ نواز جیسے بزرگ نے حسن کی غزلوں کا تتبع کیا ہے۔ جس کا خود انھوں نے اپنے دیوان "انیس العشاق" میں ذکر کیا ہے ●●

سید اعظم الحسینی، آرکیوسٹ،
ایم۔ اے، عثمانیہ

موسیو ریمانڈ فرانسیسی"

اسٹیٹ آرکائیوز آندھرا پردیش ریکارڈز کی روشنی میں

موسیو ریمانڈ مشہور فرانسیسی جنرل تھا جس کا پورا نام لینڈمارکس آف دی دکن کے بموجب Mons. Michel Joachim Marie Raymond ہے۔
تاریخ مذکور کی بموجب ریمانڈ ۱۷۵۵ء میں فرانس میں پیدا ہوا۔ آصف جاہ دوم نواب میر نظام علی خاں کے عہد حکومت میں عمدہ عہدوں پر فائز تھا۔ اس کی بھی خواہش ڈوپلے اور للّی کی طرح انگریزوں پر فوقیت حاصل کرنے کی تھی۔ اس نے نہ صرف بڑے بڑے عہدے حاصل کئے بلکہ کافی شہرت و عزت بھی حاصل کی۔ بقول میلسن Malleson کسی یوروپین نے ریمانڈ سے پہلے اور بعد مقامی باشندوں میں اتنی عزت، افتخار، محبت و مدّاحی حاصل نہیں کی۔ حتیٰ کہ ریمانڈ کا سالانہ عرس منایا جاتا تھا۔

اس نے بندوقیں بنانے کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ وہ مقام آج بھی گن فاونڈری (توپ کا سانچہ) کے نام سے موسوم و مشہور ہے۔ موسیو ریمانڈؒ کا نام غلط طور پر موسیٰ رام مشہور ہوگیا ہے چنانچہ وہ گارڈن (باغ) جہاں ریمانڈ کی رجمنٹ رہتی تھی موسیٰ رام باغ سے مشہور ہے۔

ریمانڈ ۱۷۷۵ء میں بغرض تجارت پانڈیچری آیا لیکن جلدی اُس نے تجارت ترک کر کے ہتھیار سازی کا پیشہ اختیار کیا پھر ٹیپو سلطان کی ملازمت اختیار کی بعد میں بُسّی کی ۱۷۸۳ء میں ہندوستان دوبارہ واپسی پر ریمانڈ اس کے ساتھ ہوگیا۔ دو سال بعد بُسّی کی موت پر ریمانڈ فوجی دستہ کا کمانڈر ہوگیا۔ پھر آصف جاہ دوم کی ملازمت اختیار کرلی (ملاحظہ ہو ساونیر یکم جنوری ۱۹۳۶ء مطبوعہ حیدرآباد گورنمنٹ سنٹرل پریس)۔

مغل شہنشاہیت کے زوال، اندرون ملک طوائف الملوکی صوبہ داروں کی مطلق العنانیت کے نتیجہ میں بیرونی اقوام ہندوستان میں مختلف راہوں و طریقوں سے ملکی اقتدار و سیاسی معاملات میں نہ صرف دلچسپی لینے لگیں بلکہ بتدریج دخل انداز ہونے لگیں جن میں بالآخر فرانسیسیوں اور انگریزوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان دونوں اقوام نے مختلف صوبوں میں اپنا اثر رسوخ ہی نہ بڑھایا بلکہ اپنی فوجی طاقت بھی قائم کرلی اور یہاں سے اُن کے درمیان بھی حلیف و حریف گروہ پیدا ہوکر برتری بلکہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے کشمکش کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ان مراحل میں انگریز کامیاب ہوئے۔ ہمیں یہاں اس تفصیل میں جانا نہیں ہے بلکہ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز ریکارڈز کی روشنی میں موسیو ریمانڈ کے حالات پر جس قدر روشنی پڑ سکتی ہے اس کا جائزہ لینا ہے۔ ویسے ریمانڈ کی سیاسی و فوجی سرگرمیوں اور مختلف معرکوں کا تذکرہ کتب تواریخ مثلاً گلزار آصفیہ، تاریخ دکن مولفہ نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی و نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل میں ملتا ہے۔

آرکائیوز ریکارڈز کی رو سے ریمانڈ کو مختلف اہم عہدوں پر فائز کیا گیا تھا اور ریمانڈ کو کئی خطابات و اعزاز عطا کئے گئے تھے بلکہ ریمانڈ کے

ہمراہیوں کو بھی کئی خطابات و اعزاز دیئے گئے۔ جن کی دلچسپ و تاریخی اہمیت کی تفصیل آرکائیوز کے دستاویز "فہرست منصبداران درگاہ خلائق پناہ" میں ملتی ہے۔

چنانچہ مورخہ ۲۰ صفر سنہ ۳۱ ج شاہ عالم مطابق ۲۰ صفر سنہ ۱۲۰۴ھ ریمانڈ کو "اژدر جنگ بہادر" کا خطاب، سہ ہزاری ذات منصب علم و نقارہ کا اعزاز عطا ہوا۔ مورخہ ۲ ذی حجہ سنہ ۱۲۰۶ھ کو اضافہ منصب و خطاب عطا ہوا یعنی چار ہزار بذات مع علم و نقارہ اور "اژدر الدولہ" کا خطاب دیا گیا۔ مورخہ ۹ جمادی الاول سنہ ۱۲۱۲ھ کو "متہور الملک" کا خطاب بھی عنایت کیا گیا۔

جہاں دستاویز مذکور سے ریمانڈ کو عطا کردہ خطابات و اعزاز کی تاریخ و سنہ وار تفصیل ملتی ہے وہیں اس کی تاریخ وفات بھی اس طرح مندرج ہے۔

شہر شوال سنہ ۱۲۱۲ھ گو کہ اس میں تاریخ کا ذکر نہیں لیکن مہینہ و سنہ دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ۲۰۷ الف کے آورجہ کے اندراجات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ماہ شوال سنہ ۱۲۱۲ھ میں موسیو ریمانڈ کا انتقال ہو چکا تھا۔ (ملاحظہ ہو آورجہ حیدرآباد ۲۰۷ الف صفحہ ۱۲۶ و ۱۲۷)

ان دستاویزی شواہد کے بعد لینڈ مارکس آف دی دکن میں ریمانڈ کی تاریخ وفات ۲۵ مارچ سنہ ۱۷۹۷ء مطابق سنہ ۱۲۱۳ھ صحیح قرار نہیں دی جا سکتی۔

ریمانڈ کے ہمراہی موسیو پیرون کو ۲۳ شعبان سنہ ۱۲۰۶ھ یکہزاری ذات منصب اور "بہادر" خطاب دیا گیا۔ ۹ ربیع الثانی سنہ ۱۲۰۹ھ کو منصب میں اضافہ کر کے تین ہزاری منصب ذات اور "برق جنگ" کا خطاب و علم و نقارہ کا اضافہ کیا گیا۔ یہ علاقہ سلیمان جاہ کی جمعیت کا سرگروہ تھا۔ اسی کو پھر ۹ جمادی الاول سنہ ۱۲۱۲ھ کو "تہور الدولہ" کا خطاب بھی دیا گیا۔

ریمانڈ کے ایک اور ہمراہی موسیٰ جام تس کو ۸ ار ربیع الاول سنہ ۱۲۱۰ھ کو دو ہزاری ذات منصب و علم اور "رعد جنگ بہادر" کا خطاب سے سرفراز ہوا۔

ریمانڈ کو قصبہ ابراہیم پٹن سرکار دیورکنڈہ کی خدمتِ امانت و فوجداری و شقداری بطریق اجارہ ۳ سالہ از ۱۲۰۲ف تا ۱۲۰۴ف بلا سہ بندی از تغیر رائے لچھمی چند بجمو کامل مبلغ ترپن ہزار آٹھ سو ایکروپیہ گیارہ آنہ مقرر کیا گیا۔

ریمانڈ نے اپنی مُہر سے قبولیت نامہ بتاریخ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۰۷ھ نظام کو پیش کیا کہ رقم ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ بابت پرگنہ ابراہیم پٹن سرکار دیورکنڈہ بطریق اجارہ ۳ سالہ از ۱۲۰۲ف تا ۱۲۰۴ف بر ذمہ خود قبول کیا کہ ہر سال فصل بہ فصل داخل سرکار کرے گا۔ اس قبولیت نامہ میں ثمرات کی تفصیل بھی مندرج ہیں۔ اس قبولیت نامہ پر ریمانڈ نے اپنے نام و خطاب کی مدوّر مُہر "موسی ریمون اژدر جنگ بہادر ۱۲۰۴ھ" ثبت کی ہے۔ گو یہ قبولیت نامہ اور مُہر فارسی زبان میں ہیں لیکن اِس کے حاشیہ پر ریمانڈ کی فرانسیسی زبان میں تحریری دستخط ہیں۔ اسی قبولیت نامہ پر نظام دوم کی تجویز "منظور" ثبت ہے۔ بموجب نقل عنایت نامہ مورخہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۱۰ھ کو ریمانڈ کو قصبہ پالکنڈہ کا عامل مقرر کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ نائب خود کو وہاں بھیجیں اور قصبہ مزبور میں عمل دخل رکھیں اور مبلغ پانچسو روپیے خرچ سہ بندی وغیرہ قلعہ پالکنڈہ جو وہاں کی تحصیل کے عوض بعنوان ماہوار تاریخ ورود سے انھیں احکام کے ساتھ مقرب خان بہادر کو ماہ بماہ پہنچائیں اور رسید حاصل کریں۔

ذریعہ پروانہ ۲۷ رمضان ۱۲۱۰ھ حصہ ہای وطن دیسکھی و دیسپانڈیہ گری پرگنہ گجویل سرکار میدک متعلقہ لحوا وغیرہ دیسکھاں اور لچھمی تی دیسپانڈیہ ۱۲۰۴ف میں

سرکار میں ضبط کر کے بعہدہ ریمانڈ تفویض کیا گیا۔ ایک علٰحدہ مسودہ پروانہ کے بموجب حصہ وطن دیسپانڈیہ گری پرگنہ گجویل سرکار میدک متعلقہ سیتاپتی سرکار میں خبردار ہو کر ۱۲۰۷ف سے ریمانڈ کے تفویض کیا گیا۔

مزید ایک پروانہ کے ذریعہ پرگنات گجویل سرکار میدک و سلطان پور عرف ترپاپور سے مبلغ دو لاکھ اُناسی ہزار چونسٹھ روپیہ پندرہ آنہ راجہ راجنا کو موقوف کر کے ۱۰ر ذی الحجہ ۱۲۰۹ھ سے بطریق امانی تشخیص وتحصیل خام بعہدہ ریمانڈ تفویض کر دیا گیا۔ ان مسودات میں حکام کے نام اجمالی ہدایات وغیرہ بھی مندرج ہیں۔

مورخہ ۲۵ر جمادی الثانی ۱۲۱۰ھ ریمانڈ اپنی مہر "اژدرالدولہ" (یہ مہر چوکور اور بہ زبان فارسی ہے) ثبت کر کے تفصیل تعہد دیا ہے۔ یہ کاغذ فارسی میں ہے لیکن مہر کے نیچے بہ زبان فرانسیسی، ریمانڈ کی تحریر و دستخط ہیں اس کو نظام نے "منظور" فرمایا یہ چارسالہ تعہد جملہ سینسٹھ (۶۷) لاکھ کا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

سال ۱۲۰۵ف میں سولہ لاکھ روپے ۱۲۰۶ف میں سولہ لاکھ پچاس ہزار روپے

سال ۱۲۰۷ف میں سترہ لاکھ اور سال ۱۲۰۸ف میں سترہ لاکھ پچاس ہزار روپے

ریمانڈ نے اسی تعہد پر ایک طول طویل دستاویز بطریق قبولیت و وعدہ بندی تحریر کیا ہے۔ اس پر بہ زبان فارسی چوکور مہر "اژدرالدولہ" ثبت ہے۔ یہ چھ کاغذات کو جوڑ کر تحریر کیا گیا ہے اور پشت پر ہر جوڑ کے مقام پر "اژدرالدولہ" کی متذکرہ مہر ثبت ہے۔ اسی دستاویز کے نقول بھی ریکارڈز میں پائے جاتے ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس اہم دستاویز کی تاریخ ۲۹ر جمادی الثانی ۱۲۱۰ھ ہے۔ اس دلچسپ تاریخی اہم دستاویز کا خلاصہ یہ ہے کہ "اژدرالدولہ مبلغ ۶۷ لاکھ روپیہ اصل اضافہ مالوجہات و سائرجہات مع ابواب ہمہ جہت پرگنہ حویلی میدک پرگنہ گجویل

وغیرہ محالات سرکار صوبہ حیدرآباد مع نذر سالگرہ مبارک ذمہ خزانہ، و نذر دیوانے و تحریر پیشکاری و فرمائیش یک آنے و رسوم وطن دیسمکھی و مینواری حویلی میدک وغیرہ و سرمیواری پرگنہ گجویل مع سہ بندی دیلاسہ بندی از ۱۲۰۵ف تا ۱۲۰۶ف برذمہ خود قبول کرکے اقرار کرتا ہے کہ مبلغ مذکور فصل بہ فصل داخل خزانہ سرکار کروں گا اور رعایا کو اپنے حسن سلوک سے راضی و شاکر رکھوں گا۔ تکثیر زراعت و افزونی مال و آبادی دیہات کوشش قرار ان کو کام میں لاؤں گا اگر زمین افتادہ بے کار پڑی رہے تو اُس کا جواب خود کے ذمہ سمجھے گا اور شاہراہوں کی حفاظت کرے گا کہ کسی بھی مقام پر کوئی چور و کوئی رہزن نہ آسکے احیاناً کسی کا مال کسی چور کے ہاتھ یا لوٹا جائے تو چوروں کو مال کے ساتھ پکڑا جائے گا اور مال مالک کو دلایا جائے گا اور اُس جماعتِ بد کو سزا دی جائے گی اور بغیر سندِ معتبر (بدون سند) کسی شخص پر خرچ نہ کروں گا اور کواغذ جمع و خرچ وغیرہ موافق ضابطہ بدفتر سرکار داخل کرے گا۔" دستاویز میں نیچے پرگنات حویلی میدک۔ کلبگور سلطان پور عرف نرساپور۔ ایرا ہیم پور عرف سکور۔ ادیور۔ حسن آباد سرکار ورنگل۔ موضع کا سال وغیرہ پرگنہ ہتنورہ سرکار میدک اور ان کی رقمی تفصیلات ۱۲۰۵ف تا ۱۲۰۶ف مندرج ہیں۔

نقل عنایتنامہ مورخہ ۲۹ رشوال ۱۲۱۰ھ موسومہ میران یار جنگ میں تحریر ہے کہ موضع مرکوک وغیرہ دیہات پرگنہ متعلق سرکار بھونگیر صوبہ حیدرآباد بجمع کامل نو ہزار پانچسو سینتیس روپیہ بابتہ تنخواہ جوانان بار وجہتہ کا ران شامل تعہد پرگنہ حویلی میدک وغیرہ محالات ۱۲۰۵ف اتدر الدولہ بہادر (یعنی موسیو ریمانڈ) کو گذاشت کیئے گئے تھے لیکن میران یار جنگ نے تا حال گذاشت نہیں کیا لہذا بہادر مذکور نے حسب الحکم دیہات مسطور میں تھانہ خود قائم کرلیا ہے۔ چاہیئے کہ تھانہائے دیہات مذکور

معہ محال و محصول از سنہ مذکور مزاحم نہ ہوں۔ ایلکو دکمار زمیندار انکٹ کری کے نام عنایتنامہ جاری کیا گیا کہ تعلقہ کھم وغیرہ متعلقہ کڑپہ کرناٹک بالاگھاٹ جاگیر سلیمان جاہ بطریق امانے تشخیص و تحصیل خام بعہدہ اثدر الدولہ بہادر تفویض ہے اور منجانب بہادر مذکور موسیو حام تس تفویض ہے اور چونکہ پیش کش چار تعلقہ متعلقہ کھم ضمیمہ تعلقات مقرر ہے چاہیئے کہ وجہ پیش کش موافق معمول از ابتدائی ۱۲۰۵ف بنائب بہادر کو پہنچائیں۔

موسیو ریمانڈ نے مورخہ ۵ ذی قعدہ ۱۲۰۹ھ کو جلکہ تحریر کیا ہے اس دستاویز پر بزبان فارسی "موسی ریمون اثدر جنگ بہادر" کی مدوّر مُہر ثبت ہے مہر کے نیچے فرانسیسی زبان میں ریمانڈ کی تحریر اور دستخط ثبت ہے۔ اس طویل دستاویز کی پشت پر ہر جوڑ پر وہی مُہر ثبت ہیں۔ اس دستاویز پر آصف جاہ دوم کی تجویز "منظور" ثبت ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم تاریخی دستاویز ہے۔ تعلقہ کھم کڑپہ معہ تھانہ جات بالاگھاٹ جمع کامل مبلغ چار لاکھ ایکسٹھ ہزار ایکسو چھہتر روپیہ سوا تین آنہ محالات جاگیر سلیمان جاہ بعنوان امانے از ۱۲۰۵ف موافق غرہ شوال ۱۲۰۹ھ بعہدہ ریمانڈ مقرر و تفویض کیا گیا۔ چنانچہ ریمانڈ نے ایک طویل اقرارنامہ اُمور متعلقہ کی امانتاً و دیانتاً انجام دہی کا لکھا ہے جو خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

نقل عنایتنامہ مورخہ ۲ شعبان ۱۲۱۰ھ کے بموجب محمد امین خان بہادر عرب کے نام احکام ہیں کہ مبلغ بارہ ہزار روپیہ بجنس ماہوار "لین ہائی اثدر الدولہ" بعنوان معاوضہ تنخواہ ماہ بہ ماہی محالات سرکار میدک مقرر ہے۔

پروانہ کے ذریعہ مورخہ ۱۰ ذی حجہ ۱۲۰۹ھ سدا سیو ریڈی کو موقوف

کرکے تعلقہ پرگنہ حویلی میدک وغیرہ یہ جمعکامل نولاکھ اُناسی ہزار دو پانچسو تین روپیہ بہ طریق تشخیص و تحصیل خام بعہد اژدر الدولہ بہادر کے تفویض کیا گیا۔ اسی طرح ایک علیحدہ پروانہ میں ابتدائی سنہ ۱۲۰۵ ف سے پرگنہ حویلی محالات میدک وغیرہ کا سدا سیو ریڈی کے بجائے اژدر الدولہ بہادر (ریمانڈ) کو مستقل تعلقدار بنایا گیا۔

ریمانڈ نے واجب العرض (Note) داخل کیا کہ بموجب ارشادِ نظام (آصف جاہ ثانی) اس نے رعایا و زمینداران وغیرہ کو حق و رسوم وغیرہ قبول کروایا لیکن اس سال خشک سالی و بربادی ہنگامہ نمک حرام ریڈی (یہ اشارہ غالباً سدا سیو ریڈی کی طرف ہے) وغیرہ کے سبب از روی دستاویز و تمسکات رعایا تقریباً دو لاکھ روپیہ باقی دار رہیگی آئندہ فصل سنہ ۱۲۰۶ ف میں بابجائی کرکے داخلِ خزانہ کرے گا۔ نیچے محالات وغیرہ امور کی تفصیل درج کی ہے۔

اصل قبولیت نامہ مورخہ ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۱۱ھ بزبان فارسی جس پر "اژدر الدولہ" جو کور مہر ثبت ہے مہر کے نیچے ریمانڈ کی فرانسیسی زبان میں تحریر ہے اور مکمل طویل دستخط ہے۔ کوناراو کو از شروع سال سنہ ۱۲۰۶ ف سے موقوف کرکے بطریق امانی مبلغ چھ لاکھ پچاسی ہزار پانچسو دو روپیہ سوا تین آنہ جمعکامل پرگنہ حویلی و زنگل محالات سرکار مذکور بعہدہ ریمانڈ تفویض کئے گئے۔ چنانچہ ریمانڈ نے اقرارنامہ لکھا ہے کہ امور متعلقہ دیانت و امانت بے کم و کاست و بلا تفاوت از روے عمل انجام دے گا اور اُن امور کو تفصیلاً درج کیا ہے۔ اس میں پرگنات کی مع رقوم تفصیل بھی درج کی گئی ہے۔ بہرحال یہ بڑا دلچسپ و تاریخی دستاویز ہے۔

سند کے ذریعہ کوناراو کو مورخہ ۲۷ صفر سنہ ۱۲۱۱ھ موقوف کرکے خدمت

داروغگی سائر محالات سرکار ورنگل بطریق امانی تشخیص و تحصیل خام بعہدہ اژدرالدولہ بہادر (ریمانڈ) تفویض کئے گئے اور بیوپاریوں و رعایا وغیرہ کو ہدایت کی گئی کہ سائر محالات مذکور کے سلسلہ میں نائب بہادر مذکور سے رجوع ہوں۔

سند کے ذریعہ کونارا ؤ کو موقوف کر کے پرگنہ حویلی ورنگل وغیرہ محالات مبلغ چھ لاکھ پچاسی ہزار تین سو دو روپیہ سوا تین آنہ جمعکامل بطریق امانی تشخیص و تحصیل خام از شروع ۱۲۰۶ف بعہدۂ اژدرالدولہ بہادر تفویض کئے گئے۔

ایک دوسری سند کے ذریعہ میران یار جنگ بہادر کو پرگنہ سری کنڈہ سرکار بھونگیر سے موقوف کر کے مبلغ ستاون ہزار دو سو پچھتر روپیہ پونے چھ آنہ جمعکامل از شروع سال ۱۲۰۶ف بعہدہ اژدرالدولہ تفویض کئے گئے۔

تجویز جاگیر ذات اژدرالدولہ بہادر قصبۂ ابراھیم پٹن وغیرہ دیہات سرکار دیورکنڈہ مورخہ ۲۷ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ میں "سوال توبیسد" کا حکم صادر ہوا مبلغ پچیس ہزار روپیہ جو تحصیل ۱۲۰۶ف سرکار ورنگل موسیٰ ریمون (ریمانڈ) نے جمع واصل کیا تھا بالتصواب راجہ مہیپت رام یکم ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ کو داخل سرکار کئے گئے اس نقل پر رسید کی تاریخ تحریر ۱۵ صفر ۱۲۱۵ھ لکھی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نقل رسید دفتر دیوان کو ریمانڈ کے انتقال کے تقریباً سوا دو سال بعد پہنچی کیوں کہ ریمانڈ کا انتقال از روے دستاویزات ماہ شوال ۱۲۱۲ھ کو ہوا۔

سنٹرل ریکارڈز آفیس گورنمنٹ آف آندھرا پردیش کی ۱۹۵۲ء میں شائع کردہ کتاب ڈپلومیٹک کرسپانڈنس بٹوین میر نظام علی خاں اینڈ دی ایسٹ انڈیا کمپنی میں عرضی کیپٹن کرک پاٹرک مورخہ ۱۶ جنوری ۱۷۹۶ء Appendix B ص ۳۱۰ تا

پر ہے۔ اِس عرضی میں ولیم کرک پیٹرک انگریز ریذیڈنٹ نے نظام سے استدعا کی ہے اور توجہ دلائی ہے کہ موسیو ریمانڈ جیسے میدک اور کھم کے تعلقات دیئے گئے۔ ان سرحدی تعلقات میں موسیو ریمانڈ کے عمل دخل سے کمپنی تشویش محسوس کرتی ہے اور کمپنی کے مفادات کے لئے خطرہ سمجھتی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ موسیو ریمانڈ مقامی عوام میں موسٰی رام کے نام سے مشہور ہوگیا اور ریمانڈ کی حقیقی تفصیلات و کاموں سے لوگ نا آگاہ ہیں یہ عجیب اتفاق ہے کہ ریمانڈ کی قبر آج بھی موجود ہے اور تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ ماضی میں اس کا عُرس منایا جاتا تھا بلکہ منجانب حکومت معمولِ عرس سو روپیہ مقرر تھا۔ اس کا ثبوت " سیاہہ آمدنی خزانۂ عامرہ سنہ ۱۲۶۴ سرکارِ عالی' ماہ شوال المکرم سنہ ۱۲۷۰ھ چنانچہ سیاہہ مذکور کی یہ دلچسپ عبارت تاریخی شہادت رکھتی ہے۔

" در وجہ معمول عرس موسی ریمون حسب الحکم بموجب رسید مہری امرت لعل کمندان مرقومہ ۷ رشہر صدر سنہ الیہ حوالہ موتے سنگھ اردل کمندان مذکور معہ گل محمد وغیرہ چوبداران . . . مرد مہ محمد چاند بتاریخ ۷ ہر (شوال سنہ ۱۲۷۰ھ)"

ریمانڈ کے عرس سے متعلق نظام گورنمنٹ پرائیویٹ سکریٹری آفیس کی مثل $\frac{D1}{4}$ میں بڑی دلچسپ مُراسلت ہے چنانچہ منجانب گوبند پرشاد سررشتہ دار جوانان بار وغیرہ سررشتہ فوج لین موسی ریمون مُلازم سرکارِ عالی کا مراسلہ نشان ۱۸۵ واقع ۱۰ رصفر سنہ ۱۳۱۴ھ م ۱۵ ر شہریور سنہ ۱۳۰۵ف جو مسٹر فرید ونجی صاحب پرائیویٹ سکریٹری عالی جناب نواب مدار المہام بہادر سرکارِ عالی کو بضمن عطائی ۱۰۳ روپیہ معمول سالیانہ عرس موسی ریمون لکھا گیا تھا جس کی نقل پیش ذیل ہے:

"زاید از سنو سال سے مبلغ ۳۰/ حالی معمول عرس موسی ریموں پیش گاہ سرکار
سے مرحمت ہوتا چلا آتا ہے جس کی تصدیق بملاحظہ نقل سیاہہ دفتر خزانہ عامرہ سرکار
عالی نشان ۲۱، ۴۲، ۷۹ واقع ۱۲/ اسفندار ۱۳۰۳ف و ۲۱/ مہر ۱۳۰۴ف بر کاغذ مہور مصدقہ
راجہ سری نواس راو بہادر مہتمم صاحب خزانہ عامرہ سرکار عالی بخوبی ممکن اور یہ معمول
کا پہونچنا لغایت سنہ ۱۳۰۹ ہجری بملاحظہ مراسلہ دفتر صاحب سرکار عالی شاخ ترمنہ ولغایت
وغیرہ صیغہ انعام متیقنہ نشان (۸۱۲) واقع ۲۷/ شوال سنہ ۱۳۰۹ ہجری ثابت و متحقق قطع نظر
اس کے یہ عرس ایک مدت سے جاری اور اس عرس میں اکثر مدار المہام سرکار عالی
رونق بخش ہونے رہے اور نواب سلامی جو سر ہوتے ہیں اس کی اطلاع جناب
رزیڈنٹ صاحب بہادر کو بھی ہے اور کل اخراجات ضیافت وغیرہ صاحبان انگریز
بہادر حسب الحکم اقدس بحال و اجرا پیش گاہ سرکار سے جو معمولات کہ قبل از
چوبیس سال اجرا ہیں وہ کل بحال و برقرار رہیں صرف معمول عرس موسی ریموں جو سنو
برس سے زیادہ اجرا وہ مرحمت نہ ہونیکا کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتا۔ لہذا نگذرانیدن
اصل عرضی مستیس بجھپال صاحب کمندان بر کاغذ مہولہ قیمتی دو روپیہ با چہار قطعہ کاغذات
اصل متذکرہ بالا مستلف ہے کہ براہ عنایات عرضی مذکور بملاحظہ جناب خداوند نعمت
عالی جناب نواب مدار المہام بہادر سرکار عالی مدظلہم العالی گذرانیدہ بعد صدور
حکم دربارہ جاری رہنے معمول عرس مذکور بدستور و ایصال معمول رقم سالہا ماضیہ
دفتر معتمد صاحب فینانس پر حکم اجرا فرما کے منشی اس کا جواب میں احقر کو
مرحمت فرمایا جائے۔ فقط۔

گوبند پرشاد۔"

اس کے جواب میں ایک مراسلہ ۲۲۸۶ مورخہ ۱۸ ارشہر یور ۳۰۵ ف دفتر پرائیوٹ سکریٹری مدارالمہام سرکار عالی سے معتمد امور مذہبی کے نام اس مضمون سے جاری ہوا۔

" اصل عرضی ستیس گوپال صاحب کمندان مع چہار قطعہ ملسکات معیت روبکار رائے گوبند پرشاد جیو سررشتہ دار فوج لین موسی ریمون جو وصول دفتر ہذا ہوئے حسب الحکم سرکار بمراد کارروائے مناسب اس کے ساتھ مرسل ہے۔

۲۔ منشی اس کا جواباً رائے گوبند پرشاد جیو کے پاس مرسل ہے فقط"

مذکورہ بالا مراسلت سے موسیو ریمانڈ کے عرس کے تعلق سے روشنی پڑتی ہے نظام گورنمنٹ پولٹیکل سکریٹری آفس کی مثل $\frac{D4}{a\ 25}$ موسیو ریمانڈ کے مقبرہ کے تحفظ کے بارے میں قیمتی مواد رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک انگریزی مراسلہ ۶۳۶۵ پی مورخہ ۱۴ ار اکٹوبر ۱۹۲۷ء حیدرآباد ریذیڈنسی سے نواب نظامت جنگ بہادر صدرالمہام پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کو لکھا گیا۔ جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

" لفٹننٹ کرنل ڈبلیو۔ سی۔ کرک وڈ، او۔ بی۔ ای، $\frac{3}{19}$ حیدرآباد رجمنٹ کی درخواست پر، مجھ سے خواہش کی گئی کہ آپ کو مطلع کروں کہ ایک درخت موسیو ریمانڈ کے مقبرہ کی بنیاد سے باہر کی طرف بڑھ رہا ہے اگر اس کو ایسے ہی باقی رہنے دیا گیا تو مقبرہ کو نقصان پہنچے گا۔ لفٹننٹ کرنل کرک وڈ کی اس معاملہ میں دلچسپی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اُن کی رجمنٹ کی ابتداء موسیو ریمانڈ نے ۱۷۹۴ء میں ڈالی اور وہ اس لئے قدرتاً مضطرب ہیں کہ مقبرہ کی حفاظت کی جانی چاہیئے اور درخت کو نکال دینا چاہیئے۔

۲۔ ریذیڈنٹ محسوس کرتے ہیں کہ ہز اگزالٹیڈ ہائی نس گورنمنٹ تاریخی یادگار کی

حفاظت کے لئے دلچسپی رکھتی ہے ۔ اور میں اسلئے مقبرہ کا ایک فوٹو منسلک کر رہا ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درخت کو نکالدینا کسقدر ضروری ہے ۔ میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آیا آپ ازراہ مہربانی اس کے نکالنے کا بندوبست کریں گے بغیر نقصان پہونچائے مقبرہ کو۔"

اس سلسلہ میں ریذیڈنسی اور نظام حکومت میں مراسلت ہوتی رہی اور ریذیڈنسی سے یاددہانی کے مراسلے آتے رہے ۔ حکومت نظام کے عہدہ داروں نے بھی دلچسپی لی اور یہ معاملہ بالآخر چیف انجنیر و سکریٹری ٹو گورنمنٹ پی ڈبلیو ڈی کے تفویض کیا گیا ۔ چنانچہ چیف انجنیر دفتر سے مراسلہ ۲۳۳۲ مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۲۸ء بنام سکریٹری ٹو پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ جاری ہوا جس کا اُردو ترجمہ ذیل ہے ۔

" آپ کے مراسلہ ۲۱۳۶ مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۲۸ء میں آپ کو اطلاع دینے کی عزت حاصل کرتا ہوں کہ درخت جو مقبرہ کی بنیاد کے قریب تھا نکال دیا گیا اور اس کی جڑیں سلفیورک ایسڈ سے تباہ کردی گئیں اور املی کے درخت کی چند شاخیں جو مقبرہ سے کچھ فاصلہ پر تھیں وہ بھی نکال دی گئیں ۔"

یہ جواب سید عارف الدین منجانب چیف انجنیر کی دستخط سے جاری ہوا ۔

یہی اطلاع ذریعہ مراسلہ ۱۰۷۱ مورخہ ۱۱ جون ۱۹۲۸ء ریذیڈنسی کو بھی دیدی گئی ۔

اسی مثل میں مراسلہ مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۲۸ء کے ذریعہ چیف انجنیر و سکریٹری ٹو گورنمنٹ پی ڈبلیو ڈی نے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کو مزید اطلاع دی کہ

" That two road name enamel plates one each end of this road has been fixed and the work of clearing trees has been completed"

ڈاکٹر احمد حسین احمد قلعہ داری

گجرات کے جلد ساز

[محترم ڈاکٹر قلعہ داری صاحب نے ۱۹۷۳ء میں اردو زبان میں ایک کتاب "تاریخ روش کتاب سازی وکتاب نویسی در پاکستان" تالیف کی۔ جس میں دورۂ سلاطین سے لے کر اب تک پاکستان میں کتاب کی تیاری کے فنی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی انفرادیت اور خوبی یہ ہے کہ اس کا بیشتر مواد محترم مؤلف کی ذاتی معلومات، مشاہدات اور ذاتی کتب خانہ میں موجود ماخذ پر مبنی ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کا ایک حصہ ہمیں طباعت کے لیے مہیا فرمایا۔ یہ مضمون انگریزی دور میں گجرات (پنجاب) اور اسکے نواح کے ایسے جلد سازوں کے ذکر خیر پر مبنی ہے جو خود بھی صاحب علم و ہنر تھے۔
کتابشناسی]

مولوی غلام علی بن مولوی محمد عابد وزیر آبادی:

مشہور خطاط اور جلد ساز تھے۔ پرانی طرز پر عمدہ جلد بناتے تھے۔ لوگ دور دور سے ان سے جلدیں بنوایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میاں اللہ جوایا شوق سادہ چکی (زندہ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء) نے مثنوی مولانا روم لکھی اور مفید حواشی سے مرصع کیا۔ یہ کتاب پنجاب میں

اس قدر مشہور ہوئی کہ آج تک لوگ اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ میاں اللہ جوایا نے اس کی جلد بندی کے لیے میاں غلام علی کا انتخاب کیا۔ مولوی غلام علی نے جلد بناتے ہوتے چند الفاظ کاٹ دیئے۔ میاں اللہ جوایا کو غصہ آیا۔ مولوی غلام علی کو معاوضہ کی بجائے ایک طویل ہجو سے نوازا۔ یہ ہجو یہ اشعار دلچسپی سے خالی نہیں، لہٰذا یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

اندریں وقت بہر جلد کتاب — کارم افتاد بایکی قصاب
گرچہ قصاب ذابح حیوان است — آں سیہ بخت قاتل قرآن است
آں کسان کہ مجلدش خوانند — ز اشتقاق حروف نادانند
نحو این حرف گیر از من یاد — مشتق است این مجلد از جلاد
تیغ در دست بر سر مصحف — آید آنسان کہ پہلوان در صف
بسکہ از راست و چپ ہنوز قلیم — بیدرد نہ آورندش تقویم
مگر آن عزم بند آن بی دین — از پی جمع مایہ و دفتین
مصحف آرد در آب بگزارد — پس مقوای ثند بر ساند
بر در کشت صحف بستہ میان — خانہ او است سانح قرآن
جز برید و تراش نا مطلوب — نبود کار و بار آن مغضوب
تا بریدی کہ تیغ کین چو کشید — بسملہ از سر صحف برید
تا تراشی کہ از وفور تراش — تا بجدول ورق نمودہ تراش
بکتب دادہ باشی بسترا — کردہ بیں نظم و نثر بی سروپا
دید بر نسخہ کز شکنجہ اش تاب — نہ حواشی اش ماند جانہ رکاب
رفتہ رفتہ چنین گر افزاید — متن نیز از کتاب برباید

ترسم از حاشیہ عبور کند — و ز ورق متن نیز دور کند
من نہ تنہا ز جور آن بدکیش — جگر افگار گشتم و دلریش
بل نشستہ بروز بد حالان — مثنوی زار مولوی نالان
مشتہر در جہان نہ بل رسوا — بغلام علی بود اما
نہ غلامی کہ از سر اخلاص — باشد اندر حضور حیدر خاص
بل غلامی کہ تیغ کین آہیخت — خون کرار بیدریغ بریخت
زاد فاسق بخانۂ عابد — گرچہ او بود عابد و زاہد
گر ز نسل ولی آید این ملعون — علما ز انبیائی اند فزون
نہ ز تاثیر گردش دوران — نوح زادند یافت وکنعان
شمہ ز امتحان کشائی نظر — وان یزید از معاویہ بنگر

چون کتب از شکنجہ اجزایش
باد در ضغط کور اعضایش(۱)

فقط شیخ مسعود:

جلال پور جٹاں ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ مولوی محمد صالح گجراتی کے اگرد تھے۔ بہت بڑے عالم دین، خطاط اور جلد ساز تھے۔ ان کی جلد کردہ کتابیں سٹر محمد شریف صاحب جلال پوری کے پاس دیکھی ہیں۔ تمام کتاب پر چمڑا لگاتے ے۔ اس کو سرخ رنگ کر کے اس پر انڈہ کی زردی لگا دیتے تھے جس سے جلدیں

(۱) شاعر نے ہجو بیان کرتے ہوئے وزن شعری کا خیال نہیں رکھا۔ (کتاب شناسی)

لچک پیدا ہو جاتی۔ وہ لچک اور صفائی جو آئینہ کی طرح ہے آج بھی موجود ہے۔ بعض جلدیں بالکل صاف اور اعلیٰ ہیں بعض پر آب سفید سے اور بعض پر ٹھپوں سے گل کاری بھی کی ہوئی ہے۔

سید احمد ناظم:

قلعہ دار کے رہنے والے تھے۔ قلعہ دار سے شادیوال آگئے۔ مفلوک الحال تھے کاغذ کوٹ کر خود گتے بناتے، ان کے دونوں طرف جہانگیری کاغذ لگا دیتے۔ جلد بنا کر گتے کے تینوں طرف چمڑے کی کور لگاتے تھے۔ ان کے خود ساختہ گتوں والی جلد کا نمونہ میرے پاس موجود ہے۔ کتاب کی اوپر کی طرف کا اُبھار درمیان سے ہوتا۔ آج کل ابھار کی جگہ نشیب بنا دیا جاتا ہے۔ سید احمد ناظم ۱۳۰۲ ہجری میں فوت ہوئے۔

نجم الدین فائز شادیوالی:

مولوی سید احمد ناظم مذکور کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے جلد سازی کے فن میں ماہر تھے۔ کتابوں پر گتے کی بجائے خالص دیسی چمڑا لگا دیتے تھے۔ سلائی کرتے وقت کاغذوں کو سلیقہ اور طریقے سے رکھنے میں کئی دن لگا دیتے تھے۔ جلد پر تمام چمڑا لگا کر کبھی کبھی آب سفید سے خانے بھی بناتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی جلدیں نہایت دلکش اور پیاری نظر آتی ہیں۔ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں فوت ہوئے۔(۱)

غلام محی الدین سیالکوٹیؒ:

میرے کتب خانہ میں مجموعہ سلطان خانی کی جلد غلام محی الدین سیالکوٹی کی بنائی ہوئی ہے۔ اِن کا فن ہو بہو حافظ شیخ مسعود سے ملتا جلتا ہے۔ شیخ مسعود کے معاصر ہیں۔

---

(۱) سید شرافت نوشاہی کی کتاب شریف التواریخ جلد سوم حصہ نہم ص ۱۳۰ تا ۱۵۱ میں انکے مفصل حالات ملتے ہیں۔ (کتابشناسی)

حافظ محمد سلطان گجراتی:

گجرات محلہ دارا بلوچاں کے رہنے والے تھے۔ کوئی سوا سو سال پائی۔ عمر کا ایک خاص حصہ جلد سازی میں گزارا۔ زیادہ تر کچہری کے رجسٹر جلد کرتے تھے۔ دوسری جلدیں نہایت اعلیٰ بناتے تھے۔ خاص طور پر چمڑے کی جلدیں نہایت خوبصورت اور مضبوط بناتے تھے۔

مولوی شمس الدین گجراتی

حافظ محمد سلطان کے قریبی رشتہ دار اور معاصر تھے۔ حافظ صاحب کی طرح جلد سازی میں مہارت تھی بلکہ ان ہی کے مقلد اور ہم کار تھے۔ ۱۹۴۹ء میں فوت ہوئے۔

مولوی محمد حسن قلعہ داری:

مشہور عالم دین، خطاط اور جلد ساز تھے۔ ایک گاؤں میں رہائش پذیر ہونے کے باوجود جلد سازی کے آلات معیاری قسم کے پاس رکھتے تھے۔ اگرچہ قدیم فن کے استاد تھے اور قدیم ماحول میں پرورش پائی تھی۔ لیکن جلدوں میں انگریزی روش پسند کرتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں فوت ہوئے۔

علامہ مولوی محمد عالم قلعہ داری:

مولوی محمد حسن صاحب کے چچا زاد تھے۔ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے بلند پایہ عالم دین، بے مثل خطاط اور ماہر فن جلد ساز تھے۔ صرف اپنی ذاتی کتابوں کی جلدیں بناتے تھے۔ جن پر بڑی محنت کرتے تھے۔ شیرازہ بندی کے ماہر اُستاد تھے۔ چمڑے کا پشتہ اور کونوں پر کاغذ لگاتے۔ کتاب نہایت دلکش بن جاتی۔ جلد سازی میں اپنے اصولوں کے موجد تھے۔ ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔

محمد عظیم:

گجرات کے رہنے والے تھے۔ نہایت مفلوک الحال انسان تھے۔ اور کچھ ممسک بھی۔ کتابوں پر گتے کاغذ نہایت معمولی لگاتے۔ بلکہ چیتھڑوں سے اور ردی کاغذوں سے خود گتے بنا کر جلد بناتے۔ لیکن جلد نہایت عمدہ اور پائیدار ہوتی۔ راقم الحروف کے دوست تھے اور ایک عرصہ میں میری کتابوں کی جلدیں بھی بناتے رہے۔

خلیفہ محمد سعید[۱]:

نورپور آرائیاں ضلع گجرات میں رہتے تھے۔ بازار میں دکان تھی۔ پرانی طرز کی کتابیں جلد کیا کرتے تھے۔ کوئی پچاس برس ہوئے فوت ہو چکے ہیں۔

عبدالعزیز ہندوستانی[۲]:

علاقہ یوپی سے متعلق تھے۔ گجرات آکر بس رہے۔ عدالت کی قانونی کتابیں جلد کرتے تھے۔ خلیفہ محمد سعید کے شاگرد تھے۔

میاں علی محمد[۳]:

ماچھی وال علاقہ لالہ موسیٰ کے رہنے والے تھے۔ نورپور ضلع گجرات میں رہائش اختیار کر لی۔ درسی کتابیں جلد کیا کرتے تھے۔

مولوی حسام الدین[۴]

موضع رتی ضلع گجرات کے مشہور عالم دین اور خطاط تھے۔ حافظ رمضان گجراتی کے شاگرد تھے۔ جلد سازی سے خاص شغف تھا۔ پرانی طرز کی مرصع جلد کے ماہر

(۱، تا ۴) بیان قاضی عبدالعزیز مالک جدید کتب خانہ گجرات

تھے۔ معمولی سی اجرت لیتے تھے۔ اور بڑی محنت اور شوق سے کتابیں جلد کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں فوت ہوئے۔

قاضی عبدالعزیز:

مولوی حسام الدین صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ علم و ہنر کا ذوق و شوق ورثہ میں پایا۔ جلدسازی کا فن اپنے والد بزرگوار سے سیکھا۔ پرانی طرز کی مرصع جلدسازی کے بس استاد تھے۔ اور جدید طرز کی جلدسازی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ کوئی پچاس سال تک جلدسازی کا کام گجرات میں کرتے رہے۔ اِن کی بنائی ہوئی جلدوں میں مضبوطی اور دلکشی ہوتی۔ گجرات میں جلدسازی کا فن انھیں کے دم قدم سے زندہ رہا۔ جلد بنانے میں جو خوبیاں قاضی عبدالعزیز میں دیکھی گئی ہیں وہ آنے والے دور میں کہیں نظر نہیں آتیں صفائی مضبوطی اور سادگی میں حسن ان کا کمال ہے۔ ۱۹۸۱ء میں فوت ہوئے۔ راقم الحروف کی کتابیں نہایت پیار سے بناتے۔

حافظ عبدالمجید:

حضرت سائیں کرم علی شاہ صاحب کے پوتے تھے۔ علم و عقل و حسنِ عمل کی دولت سے آراستہ تھے۔ پرانی طرز کی جلدیں نہایت عمدہ بناتے تھے۔ ہم نے ان کی بنائی ہوئی جلدیں ان کے صاحبزادے حافظ عبدالحمید صاحب کے پاس بکثرت دیکھی ہیں۔ حافظ عبدالحمید صاحب عملیات کے ماہر عامل ہیں۔ (بشکریہ کتاب شناسی۔ ۱)

۱۹۸۶ء مکتبہ علمیہ لاہور

سعیدہ بیگم (لکچرار کالج آف لنگویجس)
حیدرآباد

دکنی انوار سہیلی کا لسانیاتی جائزہ

قدیم دکنی ادب کے نشو و ارتقاء کا زمانہ پندرھویں صدی سے اٹھارویں صدی کے درمیانی عرصہ پر مشتمل ہے تقریباً چار سو سال کے اس عرصہ میں دکنی شعر و ادب کے سرمایے میں جو بیش بہا اضافہ ہوا ہے وہ تاریخ ادب کا ایک لافانی نقش بن گیا ہے۔ اس کی ابدیت کی ایک وجہ ان تخلیقات کا اپنا فطری رنگ، سادگی، حقیقت نگاری اور جذب و کسب کی صلاحیت ہے۔ جس پر زبان اردو آج بھی فخر کر سکتی ہے۔

مندرجہ بالا فنی محاسن نہ صرف طبی تخلیقات میں ملتے ہیں بلکہ تراجم میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ دکنی ادیبوں نے جہاں فارسی تخلیقات کا ترجمہ کیا ہے وہاں انھوں نے اصل ماخذ سے صرف مرکزی پلاٹ مستعار لیا ہے اور اپنے فطری حقیقت پسندی کے رجحان کو کام میں لاتے ہوئے ان تراجم میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے۔

اردو زبان چونکہ فارسی کے زیر سایہ پروان چڑھی چنانچہ فارسی کے متعدد قصوں کہانیوں اور مثنویوں کو اردو قالب میں منتقل کرنے کا رجحان ایک زمانے میں کافی عام رہا ہے۔ ان میں ایک نایاب و نادر ترجمہ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی "انوار سہیلی"

کا ہے جس کو محمد ابراہیم بیجاپوری نے دکنی زبان میں "دکن انجن" کے نام سے منتقل کیا ہے اس طرح انھوں نے قدیم ہندوستانی الاصل کے مشہور سنسکرت قصہ "پنچ تنتر" کو نئی زندگی عطا کی ہے۔

دکنی انوار سہیلی کا قصہ قدیم ہندوستان کا ایک مشہور قصہ رہا ہے اس کا اصل ماخذ سنسکرت زبان کی مشہور زمانہ تصنیف "پنچ تنتر" ہے جو دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح میں کشمیر میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کا مصنف وشنو شرما نامی ایک برہمن تھا یہ شمالی ہند کا باشندہ تھا اور اپنے عہد کے نمائندہ اساتذہ میں اس کا شمار ہوتا تھا وہ ایک بہترین ماہر نفسیات بھی تھا۔ اس نے بچوں کا نفسیاتی نقطہ نظر سے تجزیہ کر کے انکی تعلیم کا ایک منفرد طریقہ ایجاد کیا تھا۔ یعنی اس نے مختلف چھوٹی چھوٹی حکایتوں پر مشتمل ایک پلاٹ تیار کیا جن کے کردار عموماً جانور ہوتے تھے۔ ان کی مدد سے وہ بچوں کو اخلاقیات کی تعلیم دیتا تھا۔ اس کی کہانیوں سے بچے نہ صرف محظوظ ہوتے تھے بلکہ خود ہی اخلاقی نکات اخذ کر کے اپنے کردار کی مناسب تشکیل کرتے تھے۔ بشیت اصولوں کی صراحت اور اخلاقی تلقین کے، یہ طریقہ کار قوم کے تعمیری نقطہ نظر سے موثر تھا۔ جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور ہر ملک کے شعر و ادب پر اس کے گہرے نقوش ثبت ہوئے اور دنیا کی تقریباً زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔

ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"پنچ تنتر" دنیا کی بڑی کتابوں میں سے ہے مختلف زبانوں میں جتنے زیادہ تراجم اس کے ہوئے ہیں اتنے غالباً کسی کتاب کے نہیں ہوتے یہی انوار سہیلی کی اصل ہے۔"

بعض ناقدین کا یہاں تک خیال ہے کہ بائبل کے بعد انوار سہیلی کے کثیر تراجم ہوئے ہیں۔

کسریٰ نوشیروان عادل ۵۳۱ء تا ۵۷۹ء نے سب سے پہلے اس کا ترجمہ پہلوی زبان میں اپنے طبیب خاص بروزیہ کی مدد سے کروایا۔ پہلوی سے اس کو سریانی اور عربی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ سنہ ۷۶۰ء کے قریب عبداللہ ابن المقفع نے "کلیلہ و دمنہ" کے نام سے عربی زبان میں وہ لاثانی ترجمہ کیا جو اس موضوع پر اب تک ترجمہ کی گئی تمام کتابوں کا ماخذ ہے۔ اس سے پہلے کے تمام تراجم گردشِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔

"انوار سہیلی" کے دیگر تراجم کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ سنہ ۹۳۰ء میں امیر نصر بن احمد کی فرمائش پر ابو عبداللہ رودکی نے اس کا ترجمہ فارسی نظم میں کیا۔

۲۔ سنہ ۱۱۶۰ء میں نصر اللہ (بہرام شاہ کے دورِ حکومت کا ایک افسر تھا) نے فارسی نثر میں اس کا ترجمہ کیا۔

۳۔ ملا حسین واعظ کاشفی نے سلطان حسین مرزا کے سپہ سالار امیر نظام الدین سہیلی کی فرمائش پر "انوار سہیلی" کے نام سے ترجمہ کیا۔

۴۔ جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں ابو الفضل فیضی نے واعظ کاشفی کی انوار سہیلی کا خلاصہ "عیار دانش" کے نام سے سنہ ۱۵۸۷ء میں لکھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل اور بعد بھی انوار سہیلی کے کئی ترجمے ہوئے جن کا تفصیلی ذکر بلوم ہارٹ نے انڈیا آفس لائبریری لندن کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست میں اس طرح کیا ہے۔

۱۔ بوستانِ حکمت از فقیر محمد گویا ۱۸۳۹ء
۲۔ ضیائے حکمت از عمر علی خاں ۱۸۶۲۔۶۳ء
۳۔ ارژنگ راضی از جان بہادری لال راضی ۱۸۷۹ء
۴۔ خرد افروز از مولوی حفیظ الدین احمد ۱۸۰۵ء
۵۔ دکنی انوار سہیلی از محمد ابراہیم بیجاپوری ۱۸۲۴ء
۶۔ انوارِ سہیلی از ملا حسن بن علی بن واعظ الکاشفی

"پنچ تنتر" کے جو مشہور تراجم ہوئے ہیں ان کی مختصر تفصیل مندرج ذیل ہے۔

کلیلہ ودمنہ: عبداللہ ابن مقفع نے ۷۶۰ء میں پنچ تنتر کے فارسی نسخہ کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔

عبداللہ ابن مقفع ایک بہت بڑا عالم تھا۔ وہ عربی فارسی کے علاوہ دیگر زبانیں بھی جانتا تھا اور پہلوی زبان پر بھی اُسے کافی عبور حاصل تھا۔ اس نے پہلوی زبان سے اسے عربی قالب میں ڈھالنے کا اہتمام کیا اور تاریخ عالم ادب میں اپنا ایک لافانی شاہکار چھوڑا۔ اس کا شمار عربی کی چند ایک بہترین تصانیف میں ہوتا ہے۔

ابن مقفع کا اسلوب سادہ اور دلکش ہے اس نے اصل قصہ کا صرف پلاٹ مستعار لیا ہے اور تخلیقی تصرف آرائی سے کام لے کر اس قصہ کو ایک نئی شکل عطا کی ہندوستانی الاصل کے اس قصہ کو دنیائے ادب سے آشنا کرنے میں اس کی ترجمہ کے اہم رول ادا کیا۔ اس عربی تصنیف کو پیش نظر رکھ کر دنیا کی کئی زبانوں میں اس کے بے شمار تراجم ہوئے لطف کی بات یہ ہے کہ خود ہندوستان میں بھی اس کے کئی تراجم ہوئے۔ اس طرح "پنچ تنتر" کے اصل ماخذ تک پہنچنے میں اس کی کتاب سنگِ نشاں کی حیثیت رکھتی ہے۔

فارسی انوارِ سہیلی : فارسی کے مشہور مصنف ملا حسین واعظ کاشفی نے تقریباً ۹۰۰ھ میں ابوالمعانی نصراللہ بن محمد کی کتاب "کلیلہ و دمنہ" کا ترجمہ سلطان حسین مرزا کے سپہ سالار امیر نظام الدین سہیلی کی فرمائش پر "انوار سہیلی" کے نام سے کیا۔

کاشفی نے اپنی تصنیف کو مقفیٰ اور مسجع نثر سے آراستہ کیا ہے جس سے فارسی زبان میں ان کی فنکارانہ مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف فارسی ادب بلکہ اسلامی لٹریچر اور خاص کر ہندوستان میں کافی مشہور رہی۔

کاشفی کے ترجمے کے بعد انور سہیلی کے کئی تراجم مختلف عنوانات سے کئے گئے مغربی زبانوں میں بھی اس کے تراجم کا اہتمام کیا گیا لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت دکنی انوارِ سہیلی کی ہے کیوں کہ اس میں سادہ اسلوب اور عوامی بول چال کا خیال خاص طور پر رکھا گیا ہے اس ترجمے میں اہلِ برطانیہ کی دلچسپی نے اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ کیا ہے

دکنی انوارِ سہیلی : آج سے تقریباً ایک سو باسٹھ ۱۶۲ سال قبل یعنی ۱۸۲۴ء میں محمد ابراہیم بیجاپوری نے ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور زمانہ تصنیف "انوارِ سہیلی" کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ تین سال کے طویل عرصہ میں بڑی ہی کدو کاوش کے بعد مکمل کیا گیا۔

محمد ابراہیم بیجاپوری کے حالاتِ زندگی پردۂ اخفا میں ہیں۔ "انوارِ سہیلی" کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بیجاپور کے متوطن تھے۔ باپ کا نام ملک حسین خاں اور دادا شیخ محمد بیجاپوری تھے۔ شیخ محمد صاحب ایک ہزار سوار کے جمعدار یا جاگیردار تھے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر "دکنی نثر کا انتخاب" میں لکھتی ہیں :

"بیجاپور یا مدراس کے تذکروں سے ابراہیم بیجاپوری کے حالات زندگی پر روشنی نہیں پڑتی۔ محمد ابراہیم کے والد ملک حسین خاں تھے انکے دادا شیخ محمد بیجاپوری غالباً فوج میں ملازم تھے اور جمعدار کہلاتے تھے شیخ محمد کے خاندان نے کب ترکِ وطن کر کے مدراس کا رخ کیا تھا اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں بتلایا جا سکتا۔ مدراس میں ابراہیم بیجاپوری نے پہلے ایک انگریز "طہماس ہنری منک" کی ملازمت اختیار کی اور درس و تدریس کے کام پر معمور ہوے۔" ؂۱

ہندوستان پر خاطر خواہ حکومت کرنے کے لیے انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ یہاں کی مشترکہ زبان یعنی "اردو" سے واقفیت ضروری ہے۔ چناں چہ انہوں نے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں "فورٹ ولیم کالج" کے نام سے ایک کالج کا قیام عمل میں لایا۔ اس کالج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ سے فوجی عہدوں پر معمور ہو کر آنے والے انگریز عہدیداروں کو اردو زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

اسی مقصد کے تحت مدراس میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے نام سے ایک کالج قائم کیا جہاں پر برطانیہ سے جنوبی ہند پر متعین شدہ افسروں کو مقامی زبان جو بالعموم دکن میں بولی جاتی تھی یعنی "دکنی اردو" میں تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

اس سلسلہ میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے عہدیداروں نے دکنی کے ماہر اور قابل ادیبوں کو مدراس آنے کی دعوت دی اور عام بول چال کی دکنی میں فارسی کی منتخبہ کتابیں

؂۱ "دکنی نثر کا انتخاب" ص۱۲۷

ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ ابراہیم بیجاپوری نے ہنری منک کی فرمائش پر ملا حسین واعظ کاشفی کی "انوارِ سہیلی" کو آسان دکنی میں منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ اس ترجمہ کو میر امن کی "باغ و بہار" کی طرح شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔ یہ ترجمہ چونکہ انگریز فوجی افسروں کے لیے کیا گیا تھا چنانچہ اس کی اشاعت کالج ہی کے پریس میں عمل میں آئی۔ اس کتاب کے سر ورق پر جو تحریر ملتی ہے اس سے سببِ تالیفِ کتاب پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔ لکھا ہے:

" Dukhne Unwari Saheilee
a
Translation

Into the Dukhne Tongue,
Of the
Persian Unwari Saheilee
for the use of the
Military Officers
on the
Madras stablishment
-10-10-10-10-
By order of the Board Of
Superintendence
for the

College Of Fortsaint George
by
Mohummad Ibrahim,
Moonshee / Madras
Printed at the College press. 1824." A.D [1]

(۱) دکنی انوار سہیلی سرورق — وگیانہ سرسوتی

دکنی مصنفین کی خاص خوبی یہ ہے کہ ہمیں ان کی تخلیقات میں مقامی رنگ و ماحول عام بول چال، روزمرہ، محاورہ اور فطری لہجے کی بھرپور عکاسی ملتی ہے جس کی بنا پر ان کی تخلیقات کو آفاقیت حاصل ہوی ہے۔

ابراہیم بیجاپوری نے بھی اپنے ترجمے میں اس رجحان کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ اور آزادانہ ترجمہ کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ لفظی ترجمہ نہ تو ترجمہ کے مقصد کو پورا کرسکتا ہے اور نہ ہی مفہوم کو واضح کرسکتا ہے۔ ابراہیم بیجاپوری نے فارسی قصے کے بنیادی ڈھانچے کو مستعار لیا ہے اور ذیلی کہانیوں میں مناسب حذف و اضافہ سے کام لیتے ہوے انھیں بنیادی کہانی سے منسلک کرکے ایک مربوط قصہ تیار کرلیا ہے اور مقامی آب و رنگ کی آمیزش سے اس قدیم قصہ کو جو ترجمہ در ترجمہ سے اپنی اصلیت کھوچکا تھا حیاتِ نو عطا کی۔

دکنی انوارِ سہیلی کا سائز ۲/۷ ۲۷ × ۱۷ ہے۔ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں صحت نامہ اور فرہنگ بھی شامل ہے۔ دکنی اور دکنیات میں محمد علی اثر لکھتے ہیں:

> "یہ چودہ ابواب میں منقسم ہے۔ ابتدا میں حمد و نعت، سببِ تالیفِ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کا ذکر اس کے بعد "شروع قصہ کا" کے عنوان سے داستان کا آغاز ہے۔"[1]

انوارِ سہیلی کی تمام تر کہانیوں کا انحصار غور و فکر، اخلاقی تعلیم عقل و حکمت اور دانش مندی اور عملی سوجھ بوجھ پر ہے۔ یہ تمام تعلیمات فلسفیانہ اور ناصحانہ

---

[1] دکنی اور دکنیات ص۵۱

انداز سے ہٹ کر دلچسپ کہانی قصّوں کے ذریعہ دی گئی ہیں۔

زمانہ قدیم کے بادشاہ و راجہ مطلق العنان ہوا کرتے تھے۔ انھیں دور اندیشی سیاسی تدبر اور استحکام سلطنت کے گُر راست طور پر بتانا محال تھا چناں چہ اس زمانے کے دانشور اساتذہ نے بادشاہوں کی تربیت کے لیے جانوروں کی حکایات پر مشتمل ایک فرضی پلاٹ تیار کر لیتے تھے جن میں متعدد ذیلی کہانیاں ہوا کرتی تھیں جن کے کردار عموماً بندر لومڑی، شیر، گیدڑ، خرگوش، کچھوا اونٹ وغیرہ ہوا کرتے تھے مصنف اپنی کردار نگاری کے کمال سے نہ صرف بادشاہ کو متاثر کرتا بلکہ انتظامی امور کی مناسب انجام دہی کے ذرایع بھی فراہم کرتا۔

جہاں تک دکنی انوار سہیلی کی زبان کا تعلق ہے یہ قدیم دکنی نثر کے شہکار "سب رس" کے مقابل کھڑی کی جا سکتی ہے لیکن ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے دکنی نظم و نثر کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی گو محمد ابراہیم بیجاپوری کی مادری زبان دکنی نہیں تھی پر انھوں نے اپنے دل کے اصرار پر زبان کی مدد سے ترجمہ کرنے تیار ہوتے ہیں اور اس مقصد کے لیے دکن کے دیہاتوں کا سفر کرتے ہیں متعدد طبقات کے لوگوں سے ملتے ہیں۔ گفتگو کے دوران مرد و خواتین کے روزمرہ الفاظ کہاوتیں، حکایتیں، ضرب المثال، لہجہ اور اندازِ بیان کا بغور جائزہ لے کر اپنے ترجمہ کا ڈھانچہ ترتیب دیتے ہیں۔ ان کی تحقیق و جستجو کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"شبانہ روز یہی کام تھا کہ باہم کوچہ گردی کیا کریں اور ہر ایک گویائی سے محاورات غیر مسموعات لیا کریں۔ کمال جد و جہد

وتلاشِ بیحد سے شب بیخور وخواب گذرتی تھی اور روز
پُر اضطراب"۔ [1]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں "انوارِ سہیلی" کی زبان کے بارے میں یوں رقمطراز
ہیں:

"قدیم اردو میں لسانی اعتبار سے سب سے اہم تصنیف منشی محمد ابراہیم بیجاپوری کی "انوارِ سہیلی" کا دکنی اُردو ترجمہ ہے جو ۱۸۲۴ء میں مدراس کے سینٹ جارج کالج کے پریس سے شائع ہوا ہے جس کی زبان کیا بہ اعتبار صرف کیا بہ اعتبار نحو اور کیا با اعتبار فرہنگ وجہی کی اس زبان کا تسلسل ہے جو اس نے سب رس میں استعمال کی ہے"۔

پروفیسر حامد حسن قادری دکنی انوار سہیلی کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"محمد ابراہیم بیجاپوری، مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی کے ہم عصر ہیں ان کا ترجمہ انوار سہیلی اسی سال طبع ہوا جس سال سرور نے اپنا "فسانۂ عجائب" لکھا یعنی ۱۸۲۴ء میں تصنیف کا زمانہ کچھ پہلے ہوگا ترجمہ انوار سہیلی کی تحریر اس دور کی تصانیف شمالی ہند کے مقابلے میں کسی قدر بے جوڑ معلوم ہوتی ہے دکنی الفاظ محاورات طرز بیان کی اتنی کثرت ہے کہ بعض معاصرین دکن باقر آگاہ وغیرہ کی عبارت سے بھی زیادہ قلامت آمیز ہے۔"

---

[1] دکنی انوار سہیلی ص ۱۱

ابراہیم بیجاپوری نے قدیم دکنی شہکاروں جیسے سبرس، پھول بن، گلشنِ عشق، منطق الطیر اور یوسف زلیخا کا بطورِ خاص مطالعہ کیا اور دکنی کی مضبوط بنیادوں پر انوارِ سہیلی کی عمارت کھڑی کی جس میں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ پختگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

محمد ابراہیم بیجاپوری نے اپنی تصنیف میں دکنی زبان کی قواعد کے اہم نکات کی طرف بلیغ اشارے بھی کیے ہیں جن سے زبان کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

"اے مہربان الفاظ کلیلہ و دمنہ تانیث ہے یا تذکیر اس نے جواب دیا کہ اہلِ ہند اول کو تذکیر سے محاورہ کیے ہیں، پر اہلِ دکن تانیث سے بولتے ہیں۔ اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ اکثر اہلِ ہند و دکن میں اختلاف تانیث و تذکیر ہوا ہے۔"

ابراہیم بیجاپوری نے اپنی تخلیق کے محاسن پر بھی متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے اور کہتے ہیں کہ اہلِ نظر ہی اس کے محاسن کی جانچ کر سکتے ہیں۔

"انوارِ سہیلی ایک دریا ہوش ربا ہے اور گلزارِ جاں فزا جس کو کہ دانائی شامل ہو وہی اس کے غوامض کے گرداب سے نجات پا کر ساحلِ مراد پر پہنچے اور جس کو بصارت کامل ہو وہی اس کے عرضی نزاکتِ گوناگوں کو طے کر کے منزلِ مقصود پر جا ٹھہرے۔"

ابراہیم بیجاپوری نے فارسی تصنیف کا نظم بہ نظم اور نثر بہ نثر ترجمہ کیا ہے گو وہ فنِ عروض سے ناواقف تھے جس کا ذکر انھوں نے دیباچہ میں کر دیا ہے لکھتے ہیں:

"میں فن عروض و قافیہ میں بے بہرہ ہوں مگر بطور سماعت خاطراً کہا جاتا ہے لیکن سابق میں تین چار جز تک اشعار مختلف الاوزان یہ اعتبار نظم فارسی رہے گی بعد از متفق و متحد دیکھ لیجئے۔"

یہاں پر ان کی نظم کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

"خاک کو ہوا گگن کو تم دیکھو ❊ اس کو آرام ہی نہیں ہرگز
مال و دولت سفر ہوں ملتی ہے ❊ ہوا ملتا ہے کی سفیر سے بھر
جھاڑ چلتا تو اپنی جاگہ میں ❊ اسے کا ڈر اس پو ٹوٹے تبہر"

حالانکہ ابراہیم بیجاپوری کے پیشِ نظر متعدد کہنہ مشق دکنی شعرا کا کلام تھا لیکن ان کے اشعار کے مطالعہ سے اس صنف میں ان کی کم مشقی کا پتہ چلتا ہے جس کا اعتراف انھوں نے ابتدا ہی میں کر دیا ہے۔

اب ہم یہاں پر دکنی انوارِ سہیلی کا لسانیاتی جائزہ پیش کرتے ہیں:
دکنی انوارِ سہیلی کا لسانی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے سے یہ بات منظرِ عام پر آتی ہے کہ ابراہیم بیجاپوری نے اپنی تصنیف میں عربی و فارسی کے کثیر الفاظ استعمال کیے ہیں جو شاید دکنی دیہاتوں میں مستعمل نہیں تھے۔ ان کی زبان پر دکنی کا اثر "صرف و نحو" کی حد تک ملتا ہے۔

"عالیجناب یہ کلام ابلہ فریب ملازمانِ حضور کے گوشگزار ہوا سنیئے کہ اگر کوئی اپنے سخنانِ فریب انگریز سے چوگان فوقیت پر قدم بڑھائے اور گوئے سبقت لے جائے چاہے تو وہ

> اپنی شاہد مراد سے چشم مواصلت نہ رکھے اور حلاوت سکنت
> اور لذت غربت نہ چکھے ای بھائی وہ امر عالی قدر مقام ایک
> رفیع ہی اور ملاذ ایک منیع یہہ مقام عوام الناس پر نا پدید ہی
> اور قیاس و فہم سے بعید جیسا کہ کسو فہیم کامل نے مثل عبرت
> پذیر و قول بے نظیر بیان کیا ہی۔"[1]

یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی چند مخصوص الفاظ کو چھوڑ کر بآسانی اس دکنی بولی کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔ دکنی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ جس لفظ کا تلفظ جس انداز سے ادا کیا جاتا ہے اور اس سے جو آواز نکلتی ہے اسے ویسا ہی برتا جاتا ہے اس طرح اکثر حروف حذف ہو جاتے ہیں جیسا کہ علم عروض میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اوپر کے لیے اپر' دوسرا کے لیے دسرا' کچھ کے لیے کچھ وغیرہ بعض الفاظ میں ایک یا ایک سے زائد حروف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے دُکھ' دوکھ۔ ہوگا' ہوئیگا' اُس' اوس وغیرہ۔ کہیں کہیں متحرک حروف کو ساکن اور کہیں ساکن کو متحرک بنایا جاتا ہے جیسے عقل' عقَل' اور علم کو علَم وغیرہ عموماً 'ھ' کا تلفظ غائب کر دیا جاتا ہے جیسے سُکھ' سُک' ساتھ' سات۔ کسی لفظ پر زور دینا ہوتا ہے تو "چ" کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے "ہراہی" کے لیے ہراچ۔ ابھی کے لیے ابیچ وغیرہ۔ ہاتھ' ہات۔ پڑھ' پڑ وغیرہ۔ دکنی میں الفاظ کی جمع بنانے کے لیے الف اور نون کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے پھول' پھولاں۔ عورت' عورتاں۔ نہر' نہراں۔ حرف' حرفاں' بات' باتاں۔

---

[1] انوار سہیلی ص۔

ندی، ندیاں۔ کام، کاماں بعض اوقات جمع کی مزید جمع بھی بنائی جاتی ہے جیسے امور، امورات عاقل، عاقلاں۔ انوار سہیلی کا یہ جملہ ملاحظہ کیجیے۔

"عداوت اختیار کرکر ہمارے امورات میں
ممانعت سازو خلل انداز ہوا" [1]

دکنی انوار سہیلی میں فعل کا استعمال 'ے' یا 'ں' کے اضافہ سے کیا گیا ہے جیسے ہوگا کے لیے 'ہوں گا'، کہا کے لیے 'کہیا'، دیکھا کے لیے 'دیکھنا'، چلا کے لیے چلیا، پکڑا کے لیے پکڑیا وغیرہ۔ فعل ناقص حال کے لیے 'ہے' اچھے اور ہے استعمال ہوا ہے۔ ماضی کی صورت میں تھا، اتھا واحد مونث کے لیے 'تھی' اتھی اور جمع مونث کے لیے ھتیاں، اھتیاں کا استعمال ہوا ہے۔ حروفِ شرط و جزا جب، تب کے لیے جد اور تد استعمال کیا گیا ہے۔ حروفِ تخصیص تم ہی کے لیے 'تمیچ'۔ یوں ہی کے لیے یونچ، وہیں کے لیے وہینچ، نہیں کے لیے ناج فعل معطوف کہہ کر کے لیے لگو اور کرکے کے لیے کرکر اسم فاعل جیسے کرنے والا کے لیے کرنہار بولتے والا بولنہار ضمیر اُس کے لیے 'اوس'، وہ کے لیے 'او'، تم کے لیے تمن ہم کے لیے ہمن۔ آپ کے لیے اپس ضمیر غائب کے لیے ولے۔

انوار سہیلی میں عربی اور فارسی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا بھی کثرت سے استعمال ہوا ہے جیسے चतुर، उपकार، संगीत، प्रीत، आगन، [illegible] اور [illegible] وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں۔

"اُردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی دکنی بولی ہندوستانیت

---

[1] دکنی انوار سہیلی ص ۹

میں یہاں تک شرابور ہے کہ اہل ہندی اسے ہندی کہنے پر مُصر ہیں۔"

ابراہیم بیجاپوری نے کتاب کے آخر میں جو فرہنگ دی ہے وہ مخصوص نہج کی ہے جسکی
مدد سے ہم نہ صرف دکنی انوار سہیلی کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ قدیم دکنی کی دیگر تخلیقات کو بھی سمجھنے میں
ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

دکنی انوارِ سہیلی کی اہمیت اس کی زندہ نثر اور مختلف زبانوں جیسے عربی، فارسی
ہندی، مراٹھی، گجراتی اور پنجابی کے الفاظ کے جذب و کسب کی وجہ سے ہے۔ ابراہیم
بیجاپوری نے ایسے زمانے میں جبکہ شمالی ہند کی زبان کا اثر جنوبی ہند کی زبان پر پڑنے لگا تھا
دکنی کی عظیم ترین روایات کو مٹنے سے بچالیا اور تاریخِ ادب کو ایک ایسی بے مثل تصنیف
عطا کی جو دکنی دور کی آخری تخلیقات میں سب سے زیادہ روشن تر ہے۔

مخطوطات ہمارے اسلاف کے قیمتی آثار ہیں، انہیں محفوظ رکھنا ہمارا قومی فرض
ہے۔ محققین کو ان سے استفادہ کا موقع فراہم کریں۔

(مدیر)

اقبال جہاں قدیر
بی ایس سی۔ ایم اے ایل ایل بی
(عثمانیہ)

صاحب حیدرآبادی

(حیات اور ادبی کارنامے)

نواب مظہر الدین خاں صاحبؔ حیدرآبادی مادرِ جامعہ کے ایک ممتاز فرزند تھے جنھوں نے اردو ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ایک علم دوست اور مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۹۱۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ ماجد بادشاہ محی الدین خاں مفتوں یہاں کے مشہور صوفی بزرگ حضرت معروف علی شاہ فدا کے بیٹے تھے۔ حضرت مفتوں کے بھائی ہدایت محی الدین خاں فدائی بھی ایک عالی مرتبت دینی بزرگ گزرے ہیں۔

صاحبؔ حیدرآبادی کے خاندان میں نواب عارف الدین خاں رونقؔ مظفر جنگ اور ان کے بیٹے مہدی واصفؔ کے بعد مولوی عبدالعلی والہؔ، حکیم عبدالباسط عشقیؔ، ملا عبدالقیوم، عبدالحی وصفؔ اور مولوی عبدالقدیر صاحب (قدیرؔ حیدرآبادی) فارسی اور اردو کے نامور شعرا ہوئے ہیں۔

صاحب حیدرآبادی کو ذوقِ سخن ورثہ میں ملا تھا۔ صاحبؔ کو اُن کے تایا ابا نواب زین العابدین خاں نے اپنا فرزندِ آغوشی بنا لیا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ باٹ سے

ان کی پرورش ہوئی۔ محلہ چھتہ بازار میں ٹیپو خان کی مسجد سے متصل ان کا مکان تھا۔ حضرت فدائی بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ حضرت ابو نصر المحمودی قبلہ جو حج کر کے ان کے مکان میں مہمان ہوئے تو صاحب بچپن ہی میں ان کے مرید ہو گئے۔ عالموں اور درویشوں کی صحبت نے صاحب کی مذہبی علمیت کو چار چاند لگا دیئے۔

صاحب کی ابتدائی تعلیم سٹی ہائی اسکول میں ہوئی۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں شعر کہنا شروع کیا۔ اُن کی شاعری کا ابتدائی دور ۱۹۲۵ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ صاحب سولہ برس کے تھے۔ غزلیں لکھا کرتے تھے۔ اپنے مدرسے کے اُستاد میکس مولود خاں کے آگے اُنھوں نے زانوے ادب طے کیا تھا۔ ان کے ابتدائی دور کا کلام اب ناپید ہے۔

۱۹۳۸ء میں صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ فارسی اور اُردو لیٹریچر ان کے مضامین تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر سید محمد اور میر حسن صاحب جیسے قابل اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ صاحب کے ہم جماعت طلباء میں ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ، مبارز الدین رفعتؔ، علی احمد جلیلیؔ، ڈاکٹر عابد علیخاں، ڈاکٹر جمیل جالبی اور رشید قریشی تھے جنھوں نے اپنی علم دوستی اور سخن پروری سے مادرِ جامعہ کا نام روشن کیا ہے۔

۱۹۴۱ء میں بی۔ اے کیا اور پھر سرکاری ملازمت اختیار کر لی محکمہ مال کی عہدہ داری پر صاحب کا تقرر ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں نواب زین العابدین خاں کی بہن عابدہ بیگم سے اُن کی شادی ہوئی۔

صاحب نے اپنی شادی کی قطعہ تاریخ خود نکالی ہے۔

چہ سراپا توے خوب مطلوب بود — پسند آمدہ یک تن حاضرہ
چہرزاد جانب زغیب سال — کہ پوشم لباس تن فاخرہ
نکاح جمیلہ چوں بندم بدو — گدائے مظفر شدہ خاجرہ

جن کے بطن سے دو بیٹیاں فیض النساء اور بشیر النساء پیدا ہوئیں۔ ۱۹۴۶ء میں جناب نے ایک اور عقد کیا۔ ان کی دوسری بی بی حسینہ شہزادی بیگم ہیں جن سے ایک لڑکا نواب داور علی خاں اور ایک لڑکی بسری بیگم ہیں۔

صاحب حیدرآبادی کو دوران ملازمت گاؤں گاؤں پھرنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے انھیں اپنی ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا لیکن ذوقِ سخن کی چنگاری جو اُن کی طبیعت میں سرایت کر گئی تھی بجھنے نہ پائی۔ ۱۹۶۲ء سے صاحب کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں صاحب تلگنڈہ میں ڈپٹی تعلقدار کی حیثیت سے متعین تھے۔ وہاں ان کے ہم مکتب سعید شہیدی سے اُن کی ملاقات ہو گئی۔

جب صاحب نے انھیں اپنا کلام سنایا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ ایک مرتبہ سعید شہیدی نے صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرے کا اہتمام بھی کیا۔ اہل فکر و فن اور سعید شہیدی کی قدر دانی سے صاحب کی شاعری کا چرچہ ہونے لگا اور شعر و سخن کی محفلیں سجنے لگیں۔

۱۹۶۴ء میں صاحب طویل رخصت پر حیدرآباد آ گئے تھے۔ اسی وقت یہاں ادارہ قدر ادب کی دو بیتی محفلوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جناب ... نے صاحب کو دعوت کلام دی۔ ... محفلوں میں وہ باقاعدہ شریک ہوتے رہے۔

ان کی رُباعیات پسند کی جاتیں جی بھر کے داد ملتی۔ ۱۹۶۹ء قدر صاحب نے میر ثامن علی نیساں سے ان کا تعارف کروایا۔ نیساں کی صحبت نے صاحب کی رُباعی گوئی پر سونے پہ سُہاگے کا کام کیا۔ حضرت نیساں سے وہ مشورہ سخن لیتے رہے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں صاحب نے بے حساب دلکش اور موثر رُباعیات اور تاریخی قطعات پر مشتمل ان کی تخلیقات سخن در سخن، اُفق در اُفق، انجمن در انجمن، ورق در ورق اور سلسلہ در سلسلہ چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔

۱۹۷۲ء میں وظیفہ لینے کے بعد صاحب نے اپنی ساری زندگی لیلائے سخن کے گیسو سنوارنے میں صرف کر دی۔ حیدرآباد میں اربابِ سخن کی صحبتوں نے ان پر پروانے کا کام کیا۔ اسی زمانے میں صاحب کی ایک اور تصنیف .... گلستانِ حمد و نعت و منقبت منظر عام پر آئی۔ ان کا دل [illegible] کی محبت میں سرشار نظر آتا تھا۔ [illegible] رسول اکرم ﷺ کی شان میں لکھی ہوئی [illegible] رُباعی [illegible] کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مداحِ رسولِ عربی ہوں میں بھی [illegible]

صاحب ۱۹۷۸ء میں حج بیت اللہ [illegible] خواہش کرتے تھے کہ مدینہ شریف کے آغوش میں [illegible] لیکن [illegible] پوری نہ ہو سکی۔

وطن لوٹ آئے حسرت میں ڈوبی ہوی یہ رباعی ملاحظہ ہو۔

ہوش کے ساتھ کھو گئے ہوتے
موت کی نیند سو گئے ہوتے
کیوں چلے آئے لوٹ کر صاحب
خاک یثرب کی ہو گئے ہوتے

صاحب نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزل کے میدان میں بھی انھوں نے اپنے قدم جما لیے تھے۔ غزلوں کے تین دیوان 'جوہر اندیشہ'، زبان شمع' آتش بے نام' زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں ان کا چوتھا دیوان غزل 'دو غزل' ابھی نہیں چھپا صاحب کا رنگ تغزل غالب سے ملتا ہے۔

قدیم روایتی آہنگ، فارسی کی مرکب بندشیں مانوس الفاظ اور مروجہ علامتیں۔ صاحب کے کلام میں بہاؤ اور روانی ہے۔ غم جاناں اور غم دوراں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ اپنے کلام کے اثر کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

گل کے پیراہن میں بھڑکا دی ہے آگ
صاحب ایسا دل جلا ہے شہر میں

صاحب نے اپنی زندگی میں ناکامیاں بھی دیکھیں۔ مقدمہ بازیاں بھی کیں۔ شخصیت کا اثر کلام میں جھلکتا ہے۔ اس سلسلے میں صاحب حیدرآبادی کی حسرت بھری رباعی ملاحظہ ہو۔

نظروں میں جھلکتا ہوا پیغام نہیں
ساغر میں بھرا بادۂ گلفام نہیں

اب نام کو آرام نہیں ہے دل کو
وہ صبح ہماری نہیں وہ شام نہیں

نواب زین العابدین خاں کے انتقال کے بعد صاحب نے اپنا آبائی مکان چھوڑا۔ محلہ مغلپورہ میں ایک مکان میں منتقل ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کے گھر کے قریب "اردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو صاحب نے حسب ذیل قطعہ تاریخ نکالی۔

چلو چل کر مبارک باد دیں عابد علیخاں کو
ظہیر احمد سے رکھوایا گیا تعمیر کا پتھر
ملی تقریب کی تاریخ روشن سال ہجری میں
پڑی بنیاد صاحب انجمن کی شمع "اُردو گھر"

جب اُردو گھر تعمیر ہو گیا تو اس مرکز علم و فن میں شعر و سخن کی محفلیں سجنے لگیں جن میں نواب صاحب نے جی بھر کر حصہ لیا۔ علی احمد جلیلی سے مشورۂ سخن ہونے لگا مجتبیٰ علی علوی، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، حضرت وقار خلیل، خورشید حسین جلیدی، مرزا شکور بیگ اور نہ جانے کتنی ایسی ہستیاں ہوں گی جن سے صاحب ملتے علمی مباحث ہوتے۔ وہ اپنے احباب کے گھروں پر بھی جاتے اور کبھی اُنھیں اپنے گھر پر مدعو کرتے۔ صاحب کی دعوتوں خصوصاً ان کے دادا حضرت معروف علی شاہ کے عرس میں جن کی درگاہ کے وہ سجادہ نشین اور متولی بھی تھے، شرکت کرنے والوں میں ایک بڑی تعداد شعراء اور ادباء کی بھی ہوتی۔

صاحب کے دوست ڈاکٹر حسن الدین احمد صدر ولا اکیڈیمی نے ان کی اکثر تصانیف کی طباعت کروائی تو انھوں نے ایک چھوٹی سی کتاب "اعتراف

خدماتِ ولا اکیڈیمی" لکھی۔ صاحب کی دوسری نثری کاوشوں میں "جنوبی ہند میں رباعی گوئی" "تذکرۃ الشعراء" اور "نگارشاتِ صاحب حیدرآبادی" اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

صاحب حیدرآبادی نے اپنے لڑکے کے ساتھ ساتھ اپنی لڑکیوں کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔

۱۹۸۳ء میں صاحب نے اپنے پیر و مرشد کے وصال پر ایک پُرسوز مرثیہ لکھ کر چھپوایا اور اپنے احباب میں تقسیم کیا تھا۔ اس مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

سیدی آپ کی رحلت کی خبر پہنچی ہے
کیوں نہ ہم خاک اُڑاتے ہوئے نکلیں گھر سے
دل پہ اک کوہِ الم ٹوٹ پڑا ہے فریاد
کیوں نہ سر پھوڑ لیں ٹکرا کے ہم پتھر سے

صاحب حیدرآبادی نے سوٗلہ تصانیف کی تخلیق کی ہے جو کوئی معمولی بات نہیں۔

۵ / مارچ ۱۹۸۵ء کو نواب مظفر الدین خاں امریکہ گیے پہلے اپنی بیٹی بشیر النساء کے گھر شکاگو پہنچے۔ ایک سال تک وہاں دورانِ قیام میں صاحب امریکہ کے ادبی انجمنوں کے روحِ رواں بن گیے تھے۔ شکاگو کے ادبی حلقوں نے صاحب کے کلام کو بہت سراہا۔ پھر اپنے چہیتے بیٹے کے یہاں نیویارک پہنچے وہاں ان کی آنکھوں کا آپریشن ہوا صحت خراب رہتی تھی۔ مارچ ۱۹۸۸ء کو انھیں

SVUORI

دواخانے میں شریک کروایا گیا۔ انھیں بلڈ کینسر ہوگیا تھا۔ ان کے داماد میر غیاث علی صاحب نے یہ بات بتائی کہ صاحب بسترِ مرگ پر بھی اشعار کہا کرتے تھے۔ اپنی غزل کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

چار احباب ٹھکانے کے کیسے ملتے ہیں
اپنی میّت کے لیے اپنے ہی شانے ہوں گے

ان کی آخری غزل ماہ مئی کے امریکی ماہ نامہ "پاکستانی" میں چھپی ہے۔
۷۰ برس کی عمر پاکر صاحب ۱۵ رمضان المبارک بروز شنبہ ۲ مئی ۱۹۸۹ء رات کے دو بجے دائمی نیند سو گیے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

صاحب کہتے ہیں۔

صرف غنچہ کا ایک تبسم بس
شمع کی ایک رات باقی ہے

سو برس پڑ کی زندگانی سے
مختصر سی حیات کافی ہے

محمد نسیم الدین فریس (ریسرچ اسکالر)
حیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی

دکنی شاعری میں سی حرفی کی روایت

دسویں اور گیارھویں صدی ہجری کے دوران دکنی میں صوفیانہ شاعری کی مختلف اصناف مُروّج تھیں مثلاً چکی نامہ۔ سہلا۔ حقیقت گیت وغیرہ سی حرفی بھی انہی میں سے ایک ہے۔

"سی حرفی کی تعریف یہ ہے کہ اس میں ہر مصرعہ یا بیت یا بند بالترتیب حروفِ تہجی سے اس طرح شروع کیا جاتا ہے کہ اصل حرف کی آواز یا نام بھی اس کے ساتھ موجود رہے۔ مثلاً الف سے سی حرفی کی جس بیت یا مصرعہ کا آغاز ہوگا اس کے پہلے لفظ کا پہلا حرف "الف" ہوگا۔"[1]

مثلاً الف ایمان اللہ پر لیاؤ ان سب جگ بنایا
ایسی قدرت یہ بھانت رچیا آپس آپ چھپایا (جانم)

الف اول انتہا ہو نکتہ سلطان صفی
ابتدا ہور انتہا کا اسم آپی کر خفی (شاہ سلطان)

سی حرفی کو ڈاکٹر حسینی شاہد[2] نے اپنی تصنیف "شاہ معظم" میں دکنی کی اور ڈاکٹر فقیر محمد فقیر[3] نے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" میں پنجابی زبان کی مخصوص صنف سخن بتایا ہے درآنحالیکہ سی حرفی نہ تو دکنی زبان کی مخصوص صنف سخن ہے اور

نہ پنجابی ہی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ سی حرفی کی روایت کا اولین سُراغ قدیم عبرانی اور عربی شاعری میں ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی مرتبہ انگلش اردو ڈکشنری میں لفظ Acrostic (توشیح) کی وضاحت میں لکھا ہے کہ قدیم عبرانی اور عربی شاعری میں حروف تہجی سے گرہ کر کے شعر کہنے کی روایت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید اسد علی ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات میں رقم طراز ہیں" عربی۔ فارسی کی عوامی شاعری میں ابجد۔ ہوز (الف۔ ب وغیرہ) کی ترتیب کے ساتھ اشعار لکھنے کا رواج رہا ہے جو غالباً تفریح طبع یا مظاہرہ فن کی ایک غیر تحریری شکل تھی" واضح ہو کہ فارسی میں اس صنف کو" الف نامہ" کا نام دیا گیا۔ ہندوستان آنے والے مسلم صوفیاء میں" الف نامہ" کا کافی رواج رہا۔ الف نامہ کے زیر اثر ہندوستانی سنتوں نے بھی ہندی حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق اشعار لکھنے کا طرز اختیار کیا اور اس نئی ہیت کا نام" ککہرا" یا" بارہ کھڑ" رکھا۔ ہندی میں اس کو" باون اکھری"۔ یعنی باون اچھر (حروف) والی نظم بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ ملک محمد جائیسی نے اپنی مشہور نظم" اکھراوٹ" "الف نامے" ہی کے طرز پر لکھی ہے۔ کبیر داس اور گرونانک صاحب نے الف نامے کو بنیاد بنا کر "گکہرے" لکھے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سی حرفی کی روایت کا آغاز قدیم عبرانی اور عربی شاعری میں ہوتا ہے وہاں سے یہ صنف ایران کی عوامی شاعری میں جگہ پاتی ہے۔ ہندوستان میں مسلم صوفیاء علماء کی آمد کے بعد ہندی اور پنجابی زبانیں فارسی سے اس روایت کی خوشہ چینی کرتی ہیں۔ پنجابی شاعری میں سی حرفی کا عام رواج پایا جاتا ہے اس لئے اس کے ادب میں سی حرفی بڑی اہمیت رکھتی ہے ڈاکٹر فقیر محمد فقیر لکھتے ہیں کہ" تقریباً ہر پنجابی شاعر نے سی حرفی لکھی ہے چنانچہ

سلطان باہو۔ علی حیدر، سید ہاشم شاہ۔ قادریار۔ بردا پشاوری۔ احمد علی سائیاں۔ ہدایت اللہ لاہوری کے علاوہ رحیم یار۔ محمد بوٹا گجراتی۔ باغبان۔ مسافر اور بابو کرم سب نے سی حرفیاں لکھی ہیں۔[۴۵] لیکن اس کے باوجود یہ کہنا راقم کے نزدیک غلط ہے کہ سی حرفی پنجابی کا مخصوص ادب ہے اسی طرح یہ خیال بھی برخود غلط ہے کہ یہ دکنی ادب کی مخصوص صنف سخن ہے۔ دکنی نے بھی ہندی اور پنجابی کی طرح سی حرفی کی روایت فارسی کے الف ناموں سے مستعار لی ہے۔

علم بلاغت میں سی حرفی سے ملتی جلتی ایک صنعت پائی جاتی ہے جسے توشیح یا موشح Acrostic کہتے ہیں جس میں چند شعر اس طرح لکھے جاتے ہیں کہ ہر مصرعہ کے پہلے حرف کو جمع کر لیں تو کوئی عبارت یا نام حاصل ہوتا ہے۔[۴۶] توشیح اور سی حرفی میں فرق یہ ہے کہ توشیح میں کسی مخصوص شخص کے نام یا کتاب وغیرہ کے نام میں جتنے حروف تہجی ہوں صرف انہیں سے مصرعوں کا آغاز ہوتا ہے جبکہ سی حرفی میں حروفِ ابجد کی مکمل تقطیع استعمال کی جاتی ہے۔ ہر چند کہ سی حرفی کا عمومی موضوع تصوف ہے اس کے مضامین کا مربوط و مسلسل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کا ہر شعر غزل کی طرح الگ الگ معنی و مطلب کا حامل ہوتا ہے۔ خیال کے اعتبار سے کسی شعر کا سابقہ یا آئندہ اشعار کوئی ربط و تعلق نہیں ہوتا شاعر کو آزادی ہوتی ہے کہ ہر حرف تہجی سے حسب منشاء کوئی با معنی لفظ بنائے اور اس سے کسی مصرع کا آغاز کرے۔ ہر شعر کا موضوع و مضمون جداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ تاہم ان مضامین اور خیالات کا تعلق چونکہ تصوف و سلوک سے ہوتا ہے اس وجہ سے سی حرفی کے اشعار میں ایک قسم کی داخلی وحدت کا احساس ہوتا ہے۔

سوائے حروف تہجی کی پابندی کے سی حرفی کی کوئی مخصوص ہیت نہیں ہوتی۔
دکنی سی حرفیاں بیشتر مثنوی کی ہیت میں لکھی گئی ہیں لیکن بعض ترجیع بند اور ترکیب بند کی ہیت میں بھی ہیں۔ جو سی حرفیاں ان ہیتوں میں لکھی گئی ہیں ان میں ہر بند کا پہلا مصرع ترتیب وار نئے حرف سے شروع ہوتا ہے۔ طویل سی حرفیوں کے بند مربع، مخمس یا مسدس کی ہیت میں ہو سکتے ہیں۔ اردو رسم الخط میں عربی کے (۲۸) فارسی کے مخصوص چار یعنی پ۔ چ۔ ژ۔ گ اور ہندی کے تین ٹ۔ ڈ۔ ڑ کو ملا کر جملہ (۳۵) حروف ہیں۔ ان میں چونکہ ڑ سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا اس لئے اُردو میں ۲۸ تا ۳۴ حرفِ تہجی پر مشتمل سی حرفیاں ملتی ہیں۔ سی حرفی کی ترکیب واصطلاح کی توجیہہ مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے کی ہے لیکن یہ ساری توجیہات دور از کار معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی سادہ اور آسان توجیہہ یہ ہے کہ فارسی میں سی کے معنی (۳۰) ہیں۔ عربی میں حروفِ تہجی کی روایتی تقطیع از الف تا والسلام بشمول ہمزہ کے (۳۰) حروف پر محیط ہوتی ہے اسلئے جب حروفِ تہجی سے کنایہ کرتے ہوے رموزِ معرفت اور اسرارِ حقیقت کو اشعار میں بیان کرنے کا طریقہ رائج ہوا اس کے لئے سی حرفی سے زیادہ موزوں اور بہتر اصطلاع کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ "۔۔ یہ صنف (سی حرفی) شاہ برہان الدین جانم کی دین ہے۔ "ارشاد نامہ" کے آخری حصے میں اس صنف کے ابتدائی خط و خال کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ؂

راقم کے نزدیک یہ خیال درست نہیں ہے کہ سی حرفی برہان الدین جانم کی دین ہے اُردو کی سب سے پہلی سی حرفی شاہ علی جیو گام دھنی م ۹۷۳ھ کے مجموعے

"جواہر اسرار اللہ" میں ملتی ہے پروفیسر نجیب اشرف ندوی[8] اور ڈاکٹر جمیل جالبی[9] نے بھی اسے اُردو کی پہلی سی حرفی قرار دیا ہے۔ اس طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ اس صنف کے ابتدائی خط و خال" ارشاد نامہ" میں ملتے ہیں۔ دکنی میں اس صنف کے ابتدائی نقوش دار تسلمات جانم کے والد میراں جی شمس العشاق کی نظم" شہادة التحقیق" میں ملتے ہیں جس میں الف کے بجائے "ی" سے بیانِ حروف کا آغاز ہوتا ہے۔

بے ہے واؤ نون = میم لام کاف کون
قاف ف عین غین = ط ظ ضاد معین
صاد سین بھی شین = یہ حرف شغل کے تین
بھی زر ذال دال = یہ ساتوں شغل سنبھال
خ ح جیم ث = ت بے الف لیہ

البتہ دکن میں سب سے پہلی مکمل سی حرفی جانم کے ہاں ملتی ہے۔ دکنی میں جانم کے علاوہ کریم۔ شاہ معظم۔ شاہ من عزت۔ میراں جی خدا نما۔ شاہ تراب۔ شاہ کمال۔ میرن سبزواری شاہ سلطان وغیرہ نے سی حرفی لکھی ہے۔ پیش آیند اوراق میں دکنی سی حرفیوں کا سرسری جائزہ ضبط قلم کیا جاتا ہے۔

گجرات کے مشہور صوفی شاعر شاہ علی محمد جیوگام دھنی م ۹۷۳ھ کی سی حرفی چکری کی ہیت میں ہے یعنی شروع میں ایک شعر تحت "نکتہ اول در عقدہ" ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ اس کے بعد (۲۸) بند ہیں۔ ہر بند تین ہم قافیہ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ آخری بند (نکتہ در تخلص) میں شاہ علی جیو کا پورا نام لایا گیا ہے۔ اس سی حرفی میں عربی ابجد کے ۲۸ حروف کے علاوہ "لا" کو بھی ایک حرف متصور کیا گیا ہے

اور سب کو ترتیب وار ایک ایک (بعض اوقات ایک سے زائد) بند میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سی حرفی کا آغاز الف کے بجائے عین غین اور اختتام بھی عین غین پر ہوتا ہے۔ اس کا مرکزی موضوع وحدت الوجود ہے۔ چند بند نمونتاً درج ہیں۔

میم محمد ہو کر آیا ؛ وہی سو احمد آپ کہایا

وہی احد سب بھیس لیایا

واؤ وہی سب وہی وہی ہے ؛ جے تم دیکھو وہی نہیں ہے

دیکھی چاکھی بات کہی ہے

لا تو گھونگھٹ بھاری لیایا ؛ لا تعین ہو آپ چھپایا

احد واحد سنہ تفصیل آیا ۱۰

بیجاپور کے صوفی شاعر شاہ برہان الدین جانمؒ نے سب سے زیادہ سی حرفیاں لکھی ہیں۔ اب تک ان کی تین سی حرفیاں (۱) نکتہ واحد (۲) فرمان از دیوان (۳) گفتار برہان دریافت ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمدؒ کو ان تینوں نظموں کو ایک ہی نظم کے "تین حصے" ہونے کا مغالطہ ہوا ہے (۱۱) حالانکہ یہ تینوں الگ الگ سی حرفیاں ہیں۔

نکتہ واحد کی ہیئت کو سمجھنے میں مولوی عبدالحقؒ۔ ڈاکٹر زورؒ۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر جمیل جالبی سے تسامح کا شکار ہوتے ہیں۔ ان تمام نے نکتہ واحد میں اشعار کی تعداد بارہ بیان کی ہے۔ ان حضرات سے سہو یہ ہوا ہے کہ جس کو انھوں نے دو مصرعوں کا ایک شعر سمجھا ہے دراصل وہ چار مصرعوں کا ایک بند ہے۔ اس کی صحیح ہیئت یہ ہے کہ آغاز میں دو باہم مقفّی مصرعوں پر مشتمل ایک شعر ہے اس کے تحت تین تین ہم قافیہ مصرعوں کے بند ہیں ہر بند کے آخر میں

مطلع کے مصرعۂ اول کی تکرار ہے۔ اس طرح اس سی حرفی کو بہ اعتبار ہیئت ایک مربع ترجیع بند کہا جاسکتا ہے اس میں بھی وحدت الوجودی تصورات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

نمونہ :-

نکتہ واحد آپیں احد ہے ؛ الف ذات اللہ صمد
ب بہروپ کرا آپس ایک ت تمام سوں پرگٹ دیکھ
ث ثابت کرا پیس ایک نکتہ واحد آپیں احد ہے

جانم کی دوسری سی حرفی فرمان از دیوان کا تعارف بھی نکتہ واحد کی طرح سب سے پہلے مولوی عبدالحق[16] ہی نے کرایا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی[17] نے انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی کے کتب خانہ خاص میں مخزونہ ایک مخطوطے کے حوالے سے اس کا نام "فرمان از دیوان" درج کیا گیا ہے۔ اس میں (۲۹) ابیات ہیں یا عربی کے اٹھائیس حروف ابجد کے علاوہ ایک شعر "پ" سے بھی کہا گیا ہے۔ ہیئت مثنوی کی ہے۔

نمونہ :

الف ایمان اللہ پر لیاؤ ان سب جگ بنایا ؛ ایسی قدرت بہ بھا ثت جیا اپس آپ چھپایا
ب بہروپ ان ایسا کیتا باقی اپنا کھیل بازی کھیلے آپ کھلاوے بہو دجیا میل

جانم کی تیسری سی حرفی گفتار شہ برہان کا ذکر افسر صدیقی[18] نے اپنے مضمون "سی حرفی معظم" میں کیا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہے اور اس کتب خانہ کی فہرست مخطوطات میں اس کا نام گفتار

شاہ میراںؒ" درج ہے۔ جانم کی یہ سی حرفی ترجیع بند کی صورت میں ہے۔ اس میں بارہ بند ہیں اور ہر بند کے ابتدائی تین مصرعے باہم متفق چوتھا مصرع ٹیپ کا ہے۔

نمونہ:

پیا نکتہ پرگٹ آج بھیا ؛ چاروں پنڈا دیکھن کاج کیا [19]
ج جیو میں میرے توہی بسے ؛ ح حاصل مرشد باج کے
خ خلوت میں توں آپ بسے ؛ پیا نکتہ پرگٹ آج بھیا

جانم کے یہاں ان مستقل سی حرفیوں کے علاوہ "ارشاد نامہ" کے آخری حصے میں بھی جس میں علم لدنی کے مسائل سمجھاتے ہیں سی حرفی کا طرز اظہار ملتا ہے۔ شاہ کریمؒ نے جو بعضوں کے بقول جانم اور بعضوں کے بقول میراں جیؒ شمس العشاق کے مرید تھے ایک سی حرفی شش مصراعی بند کی ہیئت میں لکھی ہے جس میں ابتدائی چار مصرعوں کے بعد ایک دوہا لایا گیا ہے۔ ہر بند میں ٹیپ کا پہلا مصرعہ مشترک ہے۔ افسر صدیقی نے مضمون سی حرفی معظم (رسالہ اردو اپریل ۳۶ء) میں اس کا نمونہ دیا ہے۔

الف ایک ایسا رب پیارا ؛ جن پھیلایا جگ سنسارا
کاف نون سے کیا ظہور ؛ ایسا ہے صاحب بھرپور
کریم کہے تو کیا کہے کچھ بھی کہا نہ جائے ؛ لار ہے اور تم ملے تماسوں کہا بسائے

محمد حسینی قادری معظم بیجاپوری عادل شاہی خاندان کے آخری فرماں روا سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ھ-۱۰۹۷ھ) کے زمانے کے ایک صوفی شاعر گزرے ہیں۔ یہ امین الدین اعلیٰ کے مرید اور قادر لنگا کوتال کے تربیت یافتہ تھے۔ شاہ معظم نے بھی ایک سی حرفی لکھی ہے جس میں انتیس ابیات ہیں۔ ابجد کے اٹھائیس حروف کے علاوہ لام الف (لا)

سے بھی گرہ کر کے ایک شعر کہا گیا۔ یہ سی حرفی مثنوی کی ہیت میں ہے اور اس میں ہر حرف کا پورا نام جزوِ شعر ہے۔ تصوف و عرفان کے مسائل اور حقیقت و معرفت کے راز و رموز اس سی حرفی کا موزوں ہیں۔

نمونہ:

الف احد میں مخفی تھا جب شوق سوں باہر آیا ؛ حرف حرف میں روپ بدل کر میم کا گھونگٹ لایا

ی یقین جب کیا معظم جب یہ خطاب پایا ؛ جیسا جس کا خیال اپجے گا ویسائی اس کا مایا[۲۰]

میراں جی خدا نما تے جو عبداللہ قطب شاہ (۱۰۸۳ھ۔ ۱۰۳۵ھ) کے عہد کے ایک بزرگ ہیں سی حرفی کہی ہے۔ انہوں نے بیجا پور جاکر امین الدین اعلیٰ سے بیعت و خلافت حاصل کی تھی۔ میراں جی کی سی حرفی تیس اشعار پر مشتمل ہے ان کی سی حرفی میں دو حروف ڈ، ذ کا ذکر نہیں البتہ انھوں نے نکتہ۔لا۔ اور والسلام سے بھی سطر بنائے ہیں اس کی ہیت مثنوی کی ہے اور حروف کے نام مصرعوں کا جزو ہیں۔ اس سی حرفی میں تصوف کے مخصوص مسائل مثلاً احدیت۔ واحدیت، حقیقت محمدی ترک خودی۔ عرفانِ نفس۔ قرب نوافل۔ فنافی الشیخ۔ نفی و اثبات۔ سلوک و شہادت اور فقر و فاقہ وغیرہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

نمونہ:

سین سلوک کا باٹ دکھاوے سو ہے مرشد سولا

شین شہادت شہید ہوئے تو او طالب پورا

میم میراں جی مرشد پایا معلوم ہوا تمام

نون نور ذاتی جب دیکھیا ہوا پیر امام[۲۱]

شاہ سلطان دکنی کے ایک بلند پایہ لیکن مجہول الاحوال شاعر ہیں۔ بعض محققوں نے انہیں گولکنڈے کا اور بعض نے انھیں بیجا پور کا باشندہ بتایا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں ان کا ایک ضخیم دیوان محفوظ ہے[۲۲] جس میں غزلیات کے آخر میں ایک سی حرفی درج ہے۔ شاہ سلطان کی سی حرفی میں تیس ابیات ہیں جس میں الف تا ی ترتیب وار تمام حروف تہجی مذکور ہوئے ہیں سوائے "عین" کے جو نہ جانے کیوں محذوف ہے۔ یہ قصیدے کی ہیئت میں ہے اور دکنی کی عام سی حرفیوں کے برخلاف اس میں یہ التزام برتا گیا ہے کہ جس حرف کا جو شعر ہے اس کا نہ صرف مصرعۂ اولیٰ بلکہ مصرعہ ثانی بھی اُسی حرف سے شروع ہو۔ مضامین کے تنوع اور دقت کے اعتبار سے یہ دکنی کی سب سے عسیر الفہم اور دقیق سی حرفی ہے۔

نمونہ:

از الف اول انتھا ہو نکتہ سلطانِ صفی .. ابتدا ہور انتہا کا اسم آپی کر خفی

بے بقا کی بے خودی لے بس بخود بیہوش ہو .. بے ندا ہور بے جسد تھا بھول اپی اپ خودی

شاہ تراب (ولادت ۱۱۳۰ھ) ایک سیلانی صوفی اور دکنی کے پُرگو شاعر تھے دیوان کے علاوہ کئی مثنویاں ان سے یادگار ہیں۔ یہ امین الدین اعلیٰ کے پڑپوتے پیر پاشاہ حسینی کے مُرید تھے۔ ان کے دیوان میں ایک سی حرفی بھی شامل ہے۔ اس میں انتیس[۲۹] اشعار ہیں۔ اٹھائیس اشعار میں اٹھائیس حروف تہجی از الف تا ی ترتیب سے مذکور ہیں انتیسواں شعر تخلص کے لئے کہا گیا ہے۔ حرف کا پورا نام جزو شعر ہے۔ ہیئت مثنوی کی ہے اور اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ جس حرف سے جو شعر شروع ہو اس میں زیادہ تر الفاظ ایسے لائے جائیں جو اُسی حرف سے شروع ہوتے ہوں۔

نمونہ:

الف اللہ آپ الہی اپروپ اونکار ۔۔۔ احد تر گن اروپ ترنجی انتہ کرن کرتار
نے تعین اول ترانن تقوا استھول ۔۔۔ تر کی تر مورتہ جسنے تر بینی تر مول [۲۳]

شاہ کمال (م ۱۲۲۴ھ) کرڑپہ کے مشہور صوفی شاہ میر کے چھوٹے بھائی اور مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے دیوان "مخزن العرفان" کے آخری حصے میں ایک سی حرفی بعنوان ... "نظم الف نامی" درج ہے۔ شاہ کمال کی سی حرفی سولہ ابیات پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے اٹھائیس حروف ابجد کا بیان نظم کیا ہے۔ یہ مثنوی کی ہیئت میں ہے اور اس میں انہوں نے تصوف کے دقیق مسائل مثلاً ذات و صفات۔ تنزیہہ و تشبیہہ وجوب و امکان کثرت و وحدت۔ غیب و ہویت۔ لا و اثبات وغیرہ سے بحث کی ہے۔

نمونہ:

او رو ہی ہے ذاتوں اپنی واحد ہے بالصفات ۔۔ باطن بالتنزیہہ وہی ہے اور ظاہر تشبیہات
تج میں اس میں فرق نہیں کچھ مگر وجوب امکانی ۔۔ ثابت کر اس طرح کوئی تا ہووے کامل انسان [۲۴]

میاں میرن سبزواری نے بھی سی حرفی لکھی ہے ان کے حالات ڈاکٹر زور نے تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول میں [۲۵] بیان کیے ہیں۔ ان کی سی حرفی ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں مخزونہ ایک قلمی بیاض میں درج ہے۔ یہ سی حرفی مسدس کی ہیئت میں ہے اس میں آٹھ بند ہیں ہر بند میں ابتدائی پانچ مصرعے ہم قافیہ ہیں اور چھٹا مصرع ٹیپ کا ہے اس تمام حروفِ ابجد کے علاوہ لا اور ہمزہ کا بھی ذکر ہے۔ آخری بند میں تخلص ہے۔

نمونہ:

صاد صادق ہو کر چل اے محبوب ۔۔ ضاد ضامن ہو کر چہ کچھ مطلوب

ظوے کو طلب ہوا، پچھ مطلوب ÷ ظوے سے ظلم تہ کر تو اب سے خوب
عیّن سے عارف ہو تایا ہوں   الف اللہ میں بھید پایا ہوں[۶]

مذکورالصدر شعراء کے علاوہ شاہ وجیہن اور شاہ محمد غوث چشتی نے بھی سی حرفی کہی ہے لیکن ان کا تعلق دکنی سے نہیں ہے اس لیے ان سے اعراض کیا گیا ہے۔ وجیہن کی سی حرفی کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے جس کا مخطوطہ نمبر ۵۴ جدید ۳۷۳۴ تصوف ہے۔

حوالہ جات

۱۔ افسر صدیقی۔ مضمون "سی حرفی معظم" مشمولہ رسالہ اردو سہ ماہی اپریل ۱۹۶۶ء ص ۲۹۔

۲۔ ڈاکٹر حسینی شاہد۔ "شاہ معظم" حیدرآباد ۱۹۷۸ء ص ۳۶

۳۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر۔ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد ۱۳ (جلد اول) دوسرا باب (فصل دوم) لاہور ۱۹۷۱ء ص ۲۳۱ - ۲۲۹

۴۔ ڈاکٹر سید اسد علی۔ "ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات" مترجم ڈاکٹر ماجدہ اسد۔ دہلی ۱۹۷۴ء ص ۲۸۶۔

۵۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر "تاریخ ادبیات" جلد ۱۳ (جلد اول) دوسرا باب (فصل دوم) ص ۲۴۰

۶۔ سید جلال الدین احمد جعفری "نسیم البلاغت" ص ۹۱ - ۹۰

۷ے "شاہ معظم" ص ۴۹

۸ے پروفیسر نجیب اشرف ندوی۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو، علی گڑھ ۱۹۶۲ء ص ۱۱۱

۹ے ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اول دہلی ۱۹۷۷ء ص ۱۱۵

۱۰ے شاہ علی جیوگام دھنی، جواہر اسرار اللہ (قلمی) مخزونہ کتب خانہ آصفیہ مخطوطہ نمبر ۱۶۶۹ تصوف ص ۱۴۴ - ۱۲۷

۱۱ے ڈاکٹر نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ص ۲۲۷

۱۲ے مولوی عبدالحق حضرت شاہ برہان الدین جانم مشمولہ رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء بازطباعت قدیم اردو کراچی ۱۹۶۱ء ص ۳۰-۲۹

۱۳ے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اردو شہ پارے حیدرآباد ۱۹۲۹ء ص ۳۲

۱۴ے علی گڑھ تاریخ ص ۲۲۷

۱۵ے ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۰۶

۱۶ے مولوی عبدالحق قدیم اردو ص ۳۰

۱۷ے تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۰۵

۱۸ے افسر صدیقی۔ سی حرفی معظم مشمولہ رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۲۶ء ص ۲۹

۱۹ے محمد اکبر الدین صدیقی۔ مرتب ارشاد نامہ حیدرآباد ۱۹۵۱ء مقدمہ ص ۵-۶

۲۰ے سی حرفی معظم (قلمی) مخطوطہ نمبر ۲۹۸ (جدید تصوف) کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد

۲۱ے ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ میراں جی خدانما حیدرآباد ۱۹۶۱ء ص ۱۱۲

۲۲ے شاہ سلطان۔ دیوان قلمی مخطوطہ ۲۱۵ مخزونہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد

۲۳ے ڈاکٹر سلطان بخش، دیوان تراب، کراچی ۱۹۶۴ء

۲۴ے شاہ کمال، مخزن العرفان (قلمی) مخطوطہ ۱۶۲۳ جدید مخزونہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد

۲۵ے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول حیدرآباد ۱۹۴۳ء [illegible]

۲۶ے مخطوطہ نمبر ۷۰۶ مخزونہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔

Rs.10/-
12/11/92

108604

ORIENTAL RESEARCH INSTITUTE
LIBRARY

ACCESSION No.

CALL No.

SRI VENKATESWARA UNIVERSITY
TIRUPATI

VIJNANA SARASWATI

THE ANDHRA PRADESH JOURNAL OF ORIENTAL - RESERCH

HALF YEARLY

VOLUME - 7 JANUARY - JUNE - 1990 Number - 1

108604

GENERAL EDITOR

Dr.V.V.KRISHNA SASTRY

M.A.Phd.

DIRECTOR

A.P.G.O.M.L. & R.I.

Hyderabad.

EDITOR

URDU ISSUE

Mir.Karamath Ali Khan

Research Officer

THE ANDHRA PRADESH GOVERNMENT ORIENTAL MANUSCRIPTS LIBRARY & RESEARCH INSTITUTE, Hyderabad.